چوتھی دُنیا
(ناولٹ)
احمد عقیل رُوبی

انیس نقوی

چوتھی دُنیا

(ناولٹ)

احمد عقیل رُوبی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

ہماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ :

اشاعت	:	۱۹۹۶ء
مطبع	:	شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	[illegible] روپے

ممتاز مفتی کے نام

انیس نقوی

زیر ملکیت انیس نقوی

پہلی دنیا

کے ہیڈ آفس میں سفید انسانوں کے بڑوں کی کانفرنس جاری تھی۔ پائپ اور سگاروں کے دھوئیں میں ان کے چہرے سوچتے تاریک ہونے شروع ہوگئے تھے۔ مہلک ہتھیاروں برق رفتار میزائلوں، دور تک نشانہ بنانے والی توپوں، زہریلی گیسوں کی فہرست ان کے سامنے تھی مگر وہ پھر بھی اندر سے ڈرے ہوئے تھے۔ یہ ڈر دوسری دنیا کا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں دوسری دنیا خفیہ ہتھیار نہ بنا لے جو ان کے علم میں نہ ہوں اور پھر وہ کہیں ان پر غالب نہ آجائے۔ دوسری دنیا ان کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ اس خطرے نے پہلی دنیا کے بڑوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ جگہ جگہ اپنے فوجی اڈے قائم کر کے بھی پہلی دنیا والے اندر سے خوفزدہ تھے۔ اس خوف سے چھٹکارا پانے کے لئے ہی وہ آج اپنے ہیڈ کوارٹر میں اکٹھے ہوئے تھے اور سر جوڑ کر اس پریشانی کا کوئی حل نکالنا چاہتے تھے۔

"اس کا ایک ہی حل ہے۔" پہلی دنیا کا ایک بڑا سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر بولا۔

"کیا حل ہے۔" میز کے گرد بیٹھے ہوئے باقی بڑے ایک ساتھ بولے۔

"اس سے پہلے کہ ہمارا دشمن ہمیں ختم کرے۔ اسے ختم کردو۔ ساری دنیا پر ہماری حاکمیت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے اعلان جنگ" سب بولے۔

"ہاں ۔ اعلان جنگ۔ ورنہ دوسری دنیا کا خوف امر بیل بن کر ہماری توانائی چوس لے گا"

اپنے بڑے کی بات سن کر سب نے اسکی تائید کردی اور دوسری دنیا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

دوسری دنیا

سرخ سفید انسانوں کے کانوں میں پہلی دنیا کے بڑوں کے مل بیٹھنے کی خبر پڑی تو وہ پل بھر میں اکٹھے ہوگئے۔ بستے شہروں اور گاتی بستیوں کو قبرستان بنانے کے مہلک ہتھیار ان کے پاس بھی کم نہ تھے۔ زمین سے آسمان اور آسمان سے زمین پر حملہ آور ہونے والے بے شمار میزائل ان کی جیب میں تھے۔ ہتھیاروں کی فہرستیں سامنے پھیلائیں تو ان کے سینے فخر سے تن گئے مگر پہلی دنیا کا خوف پھر بھی ان کے دل میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ فکر مند تھے کہ کہیں پہلی دنیا ان پر غالب نہ آجائے۔

"ہمارے اندر کا خوف ایک ہی صورت میں ختم ہوسکتا ہے۔" سرخ سفید بڑے نے میز پر مکہ مار کر کہا۔

"کون سی صورت ہے وہ" میز کے گرد بیٹھے ہوئے باقی بڑے بیک زبان

بولے۔

"اس سے پہلے کہ پہلی دنیا سر اٹھا کر ہمیں للکارے اس کا سر قلم کردو"۔ سرخ سفید رنگت والا بڑا پر جوش آواز میں بولا۔

"تمہارا مطلب ہے اعلان جنگ" سب نے کہا۔

"ہاں اعلان جنگ، پہلی دنیا کو ختم کر کے ہی ساری دنیا پر ہماری حاکمیت قائم رہ سکتی ہے۔"

اپنے بڑے کی بات سن کر دوسری دنیا کے بڑوں نے اس کی تائید کر دی۔ اور پہلی دنیا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

تیسری دنیا

کے کالے، بھوکے، پیاسے، مفلس انسان پہلی اور دوسری دنیا کے بتوں کی بات سن کر اپنے اپنے بے نور گھروں سے نکل کر فاقوں اور بیماریوں کی جلتی آگ کے گرد آکر بیٹھ گئے۔ دو مست ہاتھیوں کی دھاڑ سن کر ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ تیسری دنیا کے ایک بیمار دانشور نے کھانستے ہوئے کہا۔

"یہ دو خونخوار ہاتھی میدان میں اتر آئے تو ہمارا کیا بنے گا۔"

"وہی جو ہاتھیوں کی لڑائی میں چیونٹیوں کا ہوتا ہے۔"

ایک بوڑھے نے اپنی پنڈلی پر رینگتی ایک چیونٹی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے کہا۔

"اب ہم کیا کریں بابا" ایک نوجوان نے پوچھا

"جو کرنا ہے اب شیر کریں گے تمہیں کچھ کرنے ضرورت نہیں۔ تم مرنے کی تیاری کرو۔"

بوڑھے نے نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

پہلی اور دوسری دنیا کے ڈر کے سوالی تیسری دنیا کے کالے انسان دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

پہلی دنیا کے مہلک ہتھیاروں نے دوسری دنیا کو آگ اور بارود میں بھسم کردیا۔

تیسری دنیا کے انسانوں کا وہی حشر ہوا جو ہاتھیوں کی لڑائی میں چیونٹیوں کا ہوتا ہے۔

خدا نے جو دنیا سات دن میں بنائی تھی۔ انسان نے اسے سات گھنٹے میں تباہ و برباد کردیا۔

چوتھی دُنیا

"فرض کرو جو ناممکن ہے وُہ ممکن ہو جائے"

۲

وہ دو گھنٹے سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بھورے رنگ کا چوہا اس کے ہاتھ نہ آیا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری چوہے کے پیچھے دوڑتا رہا۔ جنگلی چوہا غیر معمولی جسامت کا مالک تھا۔ تقریباً" سات آٹھ انچ لمبا۔ فربہ جسم۔ رنگ بھورا موٹی موٹی آنکھیں۔ عام چوہوں کی نسبت اس کے کان بھی ذرا لمبے تھے۔ سات سال کی آوارہ گردی میں شاید یہ پہلی زمین پر رینگنے والی چیز تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ چوہا بہت چالاک تھا۔ اس نے بھی شاید عرصے بعد کسی انسان کی شکل دیکھی تھی۔ چوہا گھر کے اجڑے مکانوں کے ملبے میں کھانے پینے کی کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا مگر چند چھوٹے چھوٹے رینگتے کیڑوں کے سوا اسے کچھ نہ ملا۔ وہ شہر سے ذرا باہر نکلا تو درخت کے نیچے اسے ایک عجیب و غریب آدمی پڑا نظر آیا۔ آدمی کی دونوں ٹانگیں سوکھی لکڑیوں کی طرح پڑی تھیں۔ ایک پھٹی پرانی دھوتی نے انہیں ڈھانپا ہوا تھا۔ ٹانگوں کے اوپر کا حصہ گردن تک ننگا تھا۔ داڑھی کے بال ہوا سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ چوہا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور پھر آدمی کے پورے جسم کے اردگرد ایک چکر لگایا جب اسے یقین ہوگیا کہ زمین پر پڑا ہوا آدمی بے جان ہے تو وہ پیروں کو سونگھنے لگا اور چھلانگ لگا کر اسکی ٹانگوں پر رینگنے لگا۔

زمین پر پڑا آدمی چوہے کی ساری حرکات اپنی چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چوہے کے پیروں سے اس کی ٹانگوں پر ایک گدگدی سی ہو رہی تھی مگر اس نے اپنے وجود کو ساکت رکھا اور بغیر ہلے جلے آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔

چوہا اس کی دھوتی میں داخل ہوا اور پھر باہر نکل آیا۔ اس کے پیٹ پر اچھل کود کرنے لگا۔ چوہے کے پنجوں کے ناخن بڑے تیز تھے۔ چوہا باقاعدہ اس کے پیٹ کو اپنے پنجے سے کرید رہا تھا جو آدمی کے لئے بے حد تکلیف کا سبب بن رہا تھا مگر اس نے سی تک نہیں کی بس ایک ہی بات سوچ کر لیٹا تھا کہ ایک بار میرے ہاتھ آجائے تو سب بدلے لے لوں گا۔ جب وہ کالج میں پڑھاتا تھا تو اس کا ایک دوست چین کا سفر کر کے واپس لوٹا تھا۔ اس نے اپنے دوست سے پوچھا تھا۔

"چینی کھاتے کیا ہیں۔؟"

اس کے دوست نے مسکرا کر ایک جملے میں چینی قوم کی خوراک کا مینو بتلا دیا۔

"ہر ہلتی ہوئی چیز"

چوہا اب اس کے سینے پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ چوہے نے اس کی پسلیوں پر اپنی ناک اور پنجے چلائے اور پھر شرارتی انداز میں قلا بازیاں لگانے لگا۔

اسے یاد ہے اس نے اپنے دوست سے دوبارہ چینیوں کے بارے میں بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا مطلب تمہارا"

"میرا مطلب ہے۔ وہ ہر اس چیز کو کھا جاتے ہیں جو انہیں زمین پر چلتی۔ رینگتی اور ہلتی نظر آتی ہے۔"

"مثلاً" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"مثلاً" کیڑے مکوڑے' چیونٹیاں' سانپ' چھپکلی اور چوہے۔"

دوست کی بات سن کر وہ بہت حیران ہوا تھا مگر آج دنیا کی بربادی کے سات سال بعد وہ درخت کے نیچے لیٹا سوچ رہا تھا کہ اگر چھاتی پر قلابازیاں لگاتا یہ موٹا تازہ چوہا ہاتھ آجائے تو چینی بننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چوہے نے اب اس کی داڑھی کا رخ کیا چوہے کو اس کی داڑھی کے بال ہوا

میں اڑتے ہوئے بڑے اچھے لگے۔ چوہے کو پکی ہوئی گندم کی فصل کی بالیاں یاد آگئیں جو ہوا میں اسی طرح جھولتی ہیں جس طرح داڑھی کے بال لہرا رہے تھے۔ چوہا داڑھی کے گھنے بالوں میں داخل ہوگیا۔ تین سال سے اس نے نہ شیو کی تھی نہ داڑھی کے بال کاٹے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مختلف شہروں کے گھروں میں اسے نہ بلیڈ ملا تھا نہ قینچی۔ اس کی داڑھی بہت گھنی اور بال بہت لمبے ہوگئے تھے۔ چوہا اس میں کھیل کود کر بہت لطف لے رہا تھا۔ چوہا جب پروفیسر کی داڑھی کے بالوں سے ذرا زیادہ ہی بے تکلف ہوا اور کھینچ تان کرنے لگا تو اس سے درد کی کیفیت برداشت نہ ہوئی۔ بڑی تیزی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور کمال پھرتی سے داڑھی سے کھیلتے چوہے کو دبوچ لیا۔ مگر افسوس اس کے داڑھی کے بال اتنے ملائم تھے کہ چوہا اس کی گرفت میں نہ آیا۔ بالوں سے پھسل کر باہر نکل گیا۔ اس وقت سے یہ چوہے کو پکڑنے کے لئے دوڑ رہا تھا اور دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اب چوہا اور پروفیسر دونوں تھک کر نڈھال ہوچکے تھے۔ چوہا تھک کر دو تین اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا اور پروفیسر زمین پر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ چوہا اپنے دشمن کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں تو چوہا اینٹوں کی پناہ گاہ سے نکل کر شہر کے مکانوں کی طرف بھاگا۔ پروفیسر نے آنکھیں اٹھا کر اسے بھاگتے ہوئے دیکھا اور اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ چوہے نے مڑ کر اپنے دشمن کو دیکھا اور کنوئیں کے قریب ہی بنے ہوئے ایک بڑے ہال نما کمرے کے بڑے دروازے میں داخل ہوگیا۔

پروفیسر چار دیواری کے بڑے دروازے کو پھلانگتا ہوا ہال دروازے کے قریب پہنچا اور چوہے کے تعاقب میں ہال کمرے میں داخل ہوگیا۔ پروفیسر نے ہال کمرے میں چاروں طرف دیکھا مگر چوہا کہیں نظر نہ آیا۔ دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی لکڑی کی پیٹیاں ہی پیٹیاں نظر آئیں۔ دیواروں میں بنی الماریوں میں مختلف سائز کے پستول' ریوالور اور بندوقیں پڑی تھیں۔ پورا ہال اسلحہ گھر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

پروفیسر اسلحے کی اس چھوٹی سی نمائش گاہ کو دیکھ کر چوہے کو بھول گیا اور زور زور سے چلانے لگا۔

"دنیا کو تباہ و برباد کر کے اب خاموش بیٹھے ہو۔ تم نے اجاڑا ہے دنیا کی رونقوں کو۔ شہروں کو قبرستان تم نے بنایا ہے۔ تمہارے بنانے والوں نے امن کا نعرہ لگایا۔ جنگ کا کھیل کھیلا۔ معصوم بچوں' عورتوں' مردوں' بوڑھوں کی اگی کھیتیاں اجاڑ کر چپ ہو بدبختو ------!"

پروفیسر پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے چاروں طرف کمرے میں دیکھا اور ادھر ادھر بکھری اینٹیں اٹھا کر الماریوں کے شیشے توڑنے شروع کر دیے۔

"ہمارا کچھ نہیں بچا۔ میں تمہارا بھی کچھ نہیں رہنے دوں گا۔" اس نے الماریوں سے بندوقیں' پستول اور ریوالور اٹھائے اور باہر جا کر کنوئیں میں پھینک دیے۔ چوہے کا پیچھا کرتے کرتے وہ بے حد نڈھال ہو چکا تھا مگر اسلحہ دیکھ کر وہ ساری تھکن اور نقاہت بھول گیا اور تازہ دم ہو کر اسلحہ اٹھا اٹھا کر کنوئیں میں پھینکتا رہا۔ وہ سرتاپا نفرت کا پیکر بن گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہال میں آتا اسلحہ اٹھاتا اور کنوئیں میں جا کر پھینک دیتا۔ وہ گھنٹوں یہ کام کرتا رہا۔ بڑبڑاتا رہا اور اسلحہ کنوئیں میں پھینکتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے الماریاں اور پیٹیاں خالی کر دیں۔ اس نے پورے ہال میں ایک فاتحانہ نظر ڈالی بالکل اس سپاہی کی طرح جو اپنے دشمنوں کو شکست دے کر میدان جنگ میں اکیلا کھڑا ان کی لاشوں کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس نے ہال میں ایک آخری نظر ڈالی تو اچانک اس کی نظر دور کونے میں پڑی ایک چھوٹی سی پیٹی پر پڑی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ پیٹی کے قریب جا کر وہ پیٹی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اس کا ڈھکنا کھولا۔ پیٹی میں ایک بم پڑا تھا۔

"یہ منحوس کیسے بچ گیا میری نظر سے۔"

چوہا جو اس پیٹی کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ پروفیسر کی آواز سن کر پیٹی کے پیچھے سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگا پروفیسر بم کو اٹھا کر چوہے کے پیچھے دروازے سے

باہر نکلا۔ چوہا کنوئیں کی طرف بھاگا۔ اور جاکر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا پروفیسر بم لیکر کنوئیں کی طرف آیا۔ چوہے نے پروفیسر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر منڈیر سے نیچے چھلانگ لگادی اور درخت کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ پروفیسر کنوئیں کے پاس آیا اور بم کنوئیں میں پھینک دیا اور خود تیزی سے ادھر بھاگ گیا جدھر چوہا گیا تھا۔ بم کو کنوئیں کی تہہ تک جانے میں چند سکنڈ لگے اور پھر ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ پورے شہر کے اجڑے مکانات ہل گئے۔ کنوئیں کے اردگرد کی زمین پھٹ گئی اور کنوئیں میں اسلحہ چلنا شروع ہوگیا۔ پروفیسر نے بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کنوئیں سے دھواں اور آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ دھماکے جاری تھے۔ اس نے کمزوری کے باوجود بھاگنا شروع کردیا۔ پورا شہر زمین پر بچھ گیا وہ ایک راستے پر اندھا دھند بھاگتا رہا۔ چوہا ایک درخت کے پاس کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے شہر کی طرف پھر مڑ کر نہیں دیکھا اور بھاگتا بھاگتا دوسرے شہر کی حدود میں داخل ہوگیا۔ جو پہلے شہر کی طرح برباد، سونا اور اجڑا ہوا تھا۔

جس شہر میں آکر اس نے دم لیا وہ شہر نہیں تھا چند گھروں کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے والے راستے کے دائیں طرف پانچ چھ گھر تھے۔ بائیں طرف ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے ساتھ ایک کھلا میدان اور میدان کے ساتھ کچھ دکانیں۔ گھر، دکانیں اجڑی ہوئیں۔ دروازے کھلے۔ کھڑکیاں ٹوٹی ہوئیں۔ چھتیں زمین کی طرف جھکی ہوئیں۔ وہ گھروں کا جائزہ لیتا ہوا دکانوں کی طرف بڑھا۔ اسے بہت شدید بھوک لگی تھی۔ چوہے کی تیز رفتاری پر اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ بدبخت ہاتھ آجاتا تو پیٹ کا مسئلہ حل ہو جاتا۔اس گاؤں کے اردگرد اسے کوئی پھلوں کا درخت بھی نظر نہ آیا۔ جس سے پھل توڑ کر وہ پیٹ کی آگ بجھالیتا۔ بس ایک چھوٹی سی نہر پر اس نے رک کر پانی پیا۔ پانی پی کر اس نے دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہر کے پانی میں کسی جاندار شئے کو تلاش کیا مگر جب بھی پانی میں غور سے دیکھا اسے اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔ وحشی، بھوکا، بدصورت چہرہ۔

چاروں دکانوں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔ صرف دیواریں اور دروازے قائم تھے۔ ایک دکان کی الماری میں اسے لکڑی کی دو پیٹیاں نظرائیں۔ وہ بھاگ کر ان کے قریب گیا۔ مٹی گرد اور سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر پیٹی کے اوپر سے صاف کیا۔ پیٹی کا تالا ایک اینٹ سے توڑا۔ پیٹی کھولی تو اس میں بڑے چھوٹے چھوٹے کئی ڈبے نظر آئے۔ بے صبری سے ڈبوں کو کھولا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہر ڈبہ زیورات اور سونے چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ڈبے کے زیورات زمین پر ڈھیر کرنے شروع کردئے۔ پیٹی کی تہہ میں ایک لال رنگ کے کپڑے کی تھیلی پڑی ہوئی تھی۔ تھیلی کا منہ کھولا تو اس میں ایک، دو، پچاس اور سو سو کے نوٹ تھے۔ اس نے نوٹ ہوا میں اڑا دئے۔ سونے چاندی کے زیورات کو پیر سے ٹھوکر ماری۔ تھیلی سے سو سو کے تین

چار نوٹ نکال کر اپنے منہ میں رکھے اور روٹی کی طرح کھانے لگا اور پھر جا کر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ نوٹ چباتے چباتے جب اس کا منہ خشک ہونے لگا اور دانت دکھنے لگے تو اس نے نوٹ منہ سے نکال کر کنوئیں میں پھینک دئے۔ جب وہ نوٹ کنوئیں میں پھینک رہا تھا تو اس کی نظر منڈیر کے بالکل نیچے اگی ہوئی چھوٹی چھوٹی ہری گھاس پر پڑی۔ اینٹوں کے درمیان ہری ہری کچھ بیلیں بھی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ابھی صرف ان کے پتے ہی باہر سر نکال سکے تھے۔ ہری گھاس اور بیلوں کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے گھاس اور پتے ہل رہے تھے۔ اسے اپنے دوست کی بات یاد آگئی کہ چینی ہر ہلتی ہوئی چیز کو کھا جاتے ہیں۔ وہ منڈیر سے نیچے اترا اور گھاس اور پتے توڑ توڑ کر کھانے شروع کر دئے۔ اور بڑی دیر تک بھینس کی طرح جگالی کرتا رہا۔ ہرا ہرا پانی اس کے ہونٹوں کے کناروں سے باہر نکل رہا تھا اور وہ گھاس کھا رہا تھا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے ایک ڈکار لی۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور گاؤں کے درمیان کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اب اسے کہاں جانا چاہیئے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو ایک ایسا جرنیل تصور کر رہا تھا جس نے بہت سا علاقہ فتح کر لیا ہو اور اب کھڑا سوچ رہا ہوں کہ کس مہم پر روانہ ہو۔ وہ مشرق کی طرف سے آیا تھا۔ پلٹ کر ادھر جانا فضول تھا۔ چنانچہ اس نے سورج کی طرف دیکھا جو مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ اس نے سورج کے ساتھ ساتھ چلنے کی ٹھانی اور مغرب کی طرف چل دیا۔

وہ اجڑے شہر کے چوراہے پر کھڑا تھا۔ اس کے دائیں' بائیں اور سامنے تاحد نظر اجڑے جلے اور مسمار گھروں اور عمارتوں کا ایک سلسلہ پھیلا تھا۔ تیز ہوا جلی کھڑکیوں سے گزر کر ایک خوفناک گیت گنگنا رہی تھی۔ ایسا گیت وہ گزشتہ سات سال سے سن رہا تھا۔ پچھلے سات سالوں میں وہ ایسے کئی شہر دیکھ چکا تھا۔ اس کے تن پر صرف ایک دھوتی تھی۔ جو جگہ جگہ سے پھٹی ہوتی تھی۔ تیز ہوا نے جب اس کی لمبی داڑھی کے بال اس کے چہرے پر پھیلائے تو اسے الجھن ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے داڑھی کے بالوں کو سمیٹ کر (PONY - TAIL) کے انداز میں ایک گرہ دی اور دھوتی کو دونوں رانوں کے درمیان کیا اور ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور پھر چندھیائی آنکھوں سے ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگا۔ کچھ پرندے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوے جب اس کے سر سے گزرے تو اس کی آنکھوں میں نمی سی لہراگئی --- کبھی وہ بھی سر شام ان پرندوں کی طرح بھاگم بھاگ گھر جایا کرتا تھا۔ اگر کبھی لیٹ ہوجاتا تو پنکی بگڑ کر کہتی۔

"دیر سے کیوں آئے۔"

اور وہ اس کے غصیلے چہرے کو دیکھ کر بالکل بچوں کی طرح کہتا۔

"میں کیا کروں پنکی - وہ چودھری ہے نا۔ اس حرامی نے روک لیا تھا۔ کہنے لگا بس برج کی ایک بازی ہو جائے۔ I am Sorry" -اور پھر پنکی کے سامنے وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوجاتا۔ وہ باورچی خانے میں جاتی تو یہ پیچھے پیچھے۔ جب تک وہ مسکرا کر معاف نہ کردیتی اس کے ہاتھ نہ کھلتے جڑے رہتے۔

سورج غروب ہوچکا تھا۔ اس نے دیکھا دور درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چاند کسی تھکے ہارے بوڑھے کی طرح اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیلی زرد روشنی میں اجڑے شہر کے گھر بڑا ہولناک منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ اس منظر کا عادی ہوچکا تھا۔ سات سالوں میں لے دے کے یہی اجڑے گھر اس کے ساتھی تھے۔ رات وہ انہیں گھروں میں سے کسی ایک گھر میں بسر کرتا تھا۔ صبح ہوتی تو کسی اور شہر کی طرف نکل جاتا۔ اس عرصے میں اس کی کسی ہم جنس سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ وہ سینکڑوں میل سفر کرچکا تھا۔ ریگستان۔ سطح مرتفع' وادیاں' پہاڑ۔ وہ کہاں کہاں سے نہیں گزرا مگر اسے کوئی انسان نظر نہیں آیا ـــــ ایک بار وہ ایک گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اتنے عرصے کے بعد اسے اپنے علاوہ کوئی انسان نظر آیا تھا۔ اس نے اس سے بغل گیر ہونے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ دوسرے آدمی نے بھی اس وارفتگی کے ساتھ جذبات کا اظہار کیا۔ یہ بھاگ کر اس کے قریب گیا تو کسی چیز سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔اس کے سامنے قد آدم آئینہ تھا۔ جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا ـــ اس دن وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر بہت رویا۔ آئینے میں اس نے اپنے آپ سے بہت باتیں کیں۔ ایک طویل مدت کے بعد اس کی زبان کھلی تھی اسے محسوس ہوا جیسے بولنے میں اس کا ارادہ بالکل شامل نہیں۔ بس الفاظ بے ارادہ اس کے ہونٹوں سے باہر گر رہے ہیں۔

ایک بار پنکی نے اس سے کہا تھا۔

"بہت بولتے ہو تم"

"ہاں صرف اسوقت جب سامنے کوئی سننے والا ہوتا ہے"۔ اس نے ہنس کر کہا۔

"اگر سننے والا نہ ہو۔" پنکی نے کہا

"تو میں مرجاؤں گا۔"

مگر وہ سات سال سے زندہ تھا۔ وہ سب باتیں جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر جم گئی تھیں۔ اس نے کئی بار آنسوؤں کے گرم پانی سے انہیں پگھلانے کی کوشش کی

مگر وہ کوہ ہمالیہ کے قدیم گلیشیر کی طرح ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ مگر اس دن آئینے کے سامنے بیٹھ کر اس نے اتنی باتیں کیں اتنی باتیں کیں کہ اس کے منہ سے جھاگ آنے لگی اور وہ نقاہت کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا۔

چوراہے پر بیٹھے بیٹھے اس نے محسوس کیا کہ خنکی بڑھنے لگی ہے۔ اس نے چاروں طرف پھیلے اجڑے گھروں کی طرف دیکھا۔ بالکل اس بادشاہ کی طرح جو تخت پر بیٹھ کر اپنی بے شمار بیگمات پر نظر ڈال کر یہ فیصلہ کرے کہ آج رات وہ کس کی خواب گاہ میں گزارے گا ---- وہ بغلوں میں اپنے دونوں ہاتھ دبا کر کھڑا ہوا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک گھر کے دروازے میں داخل ہوگیا ---- بڑے کمرے میں چاند کی کرنیں کھڑکیوں میں سے اندر آ رہی تھیں اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دور کونے میں داہنی طرف ایک الماری پڑی تھی جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف مختلف سامان بکھرا پڑا تھا۔ ٹوٹی کرسیاں۔ دو پلنگ جن پر مٹی جمی تھی۔ پلنگ کے ساتھ والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور تیز ہوا سے بار بار ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے کر اس کی نظر الماری پر جاکر جم گئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ الماری کے قریب جاکر وہ رک گیا۔ ابھی اس نے اپنا ہاتھ الماری کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ کچھ چمگادڑیں شور مچاتی ہوئی باہر نکلیں اور اس کے چہرے پر حملہ آور ہو گئیں وہ اس اچانک حملے سے گھبرا گیا اور چکرا کر فرش پر گر گیا۔ جلدی سے چمگادڑوں کو نوچ نوچ کر دور پھینکا۔ چمگادڑیں چوں چوں کرتی ہوئیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ چند لمحوں کے لئے ششدر رہ گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کمرے میں اب کوئی چمگادڑ نہیں ہے تو وہ اٹھا اور الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کے بند دروازے کو کھولا۔ چاند کی روشنی اب سیدھی الماری پر پڑ رہی تھی اور الماری کے اندر لٹکے کپڑے صاف نظر آ رہے تھے کپڑوں کو دیکھ کر اس کو تسلی ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دو ایک کپڑے نکالے۔ غور سے دیکھا تو وہ سب کے سب زنانے کپڑے تھے۔ اس نے باری باری کپڑے نکالے مگر اسے کوئی مردانہ لباس نہ مل سکا۔ اس نے

سارے کپڑے نکال کر پلنگ پر ڈال دیئے۔ اور پھر الماری کے نچلے حصے میں ہاتھ سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر کی جستجو کے بعد جوتوں کا ایک جوڑا اس کے ہاتھ لگا۔ یہ فوجی جوتوں کا مردانہ جوڑا تھا۔ اس نے جوتوں کو آنکھ کے قریب لے جاکر اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر انہیں بھی پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ اور خود پلنگ پر چھلانگ لگا کر بیٹھ گیا جب وہ اچھل کر پلنگ پر بیٹھا تو گرد کا ایک بھبھکا اٹھا اور گرد اس کے گلے اور ناک میں داخل ہوگئی وہ دیر تک کھانستا رہا اور پھر کھانستے کھانستے پلنگ پر لیٹ گیا۔ کھانسی رکی تو اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بھوک بالکل نہیں تھی۔ جب وہ شہر میں داخل ہوا تھا تو پہلے شہر سے باہر پھلوں کے باغ میں رکا تھا۔ جہاں درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ اس نے جی بھر کر پھل کھائے تھے اور نہر سے خوب سیر ہو کر پانی پیا تھا۔

اسے بھوک بالکل نہیں مگر سردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھا اور فوجی بوٹ اٹھا کر اس میں اپنے پاؤں ڈالنے لگا۔ جوتے اس کے پیروں کے عین مطابق تھے۔ اس نے جوتے پہنے اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ کپڑوں کا ڈھیر اپنے اوپر ڈالا۔ اپنے پورے جسم کو ڈھانپا اور لیٹ گیا۔ پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور تھوڑی دیر بعد زور زور سے خراٹے لینے لگا۔

چمگادڑوں کا غول جو اس کے آنے سے باہر نکل گیا تھا۔ اندر آیا۔ اور الماری میں چلا گیا۔ ساری رات وہ خراٹے لے کر سوتا رہا۔

بادل اتنی زور سے گرجا کہ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ چمگادڑوں کے بے ہنگم شور سے کمرے کی دیواریں تک ڈر گئیں۔ باہر بہت زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کمرے کی چھت میں جگہ جگہ دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے پانی اندر تیزی سے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ پلنگ کے بالکل اوپر بہت بڑا سوراخ تھا جس میں سے پانی کی ایک بہت بڑی دھار پلنگ پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹا اور پلنگ کے کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بجلی کی چمک اور گرج سے در و دیوار کانپ رہے تھے۔ ایک بار تو بجلی ایسی کڑکی کہ اندر رکھی ہوئی الماری فرش پر آگری اور چمگادڑوں نے سارا کمرہ سر پر اٹھالیا۔ بارش کی بوچھاڑ نے پورے کمرے کو تالاب بنا دیا تھا۔ وہ پلنگ پر اور سکڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑی خوفناک بارش تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے دنیا کے سارے دریا آسمان سے زمین پر انڈیل دئے گئے ہیں۔

ایسی ہی ایک رات اس کی زندگی میں پہلے بھی آئی تھی لیکن اس رات وہ اکیلا نہیں تھا۔ پنکی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں ہنی مون منانے ایک ہل اسٹیشن (HILL' Station) کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے ڈانس فلور سے وہ کمرے میں لوٹے تو بارش اتنی زور سے برسی کہ ہوٹل کا ہر کمرہ پانی میں تیرنے لگا۔ ہوٹل کے ملازمین ساری رات کمروں سے پانی نکالتے رہے اور کمروں کی چھتیں مرمت کرتے رہے۔ پنکی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ڈبل بیڈ پر لیٹے رہے۔ کئی بار ہوٹل کے ملازم نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا۔

"صاحب آپ کے کمرے کی چھت تو نہیں ٹپک رہی"

اس نے ہر بار پنکی کو اپنے ساتھ لپٹا کر جواب دیا "نہیں۔ ہمارے کمرے میں سب کچھ ٹھیک ہے۔ (GET - LOST)"

اس دن اس کی بغل میں پنکی تھی۔

آج اس کی بغل میں پرانے زنانے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا جو اسے چمگادڑوں کی الماری سے ملا تھا۔ بجلی ایک بار پھر زور سے چمکی تو وہ ہل اسٹیشن کے ہوٹل سے اجڑے گھر میں لوٹ آیا۔ جس کے ٹوٹے اور بوسیدہ کمرے میں پڑے پلنگ پر مری چمگادڑوں کے ساتھ وہ لیٹا ہوا تھا۔ باہر بارش تقریباً" ختم ہوگئی تھی۔ آسمان پر طلوع صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے ٹوٹی دیوار سے جھانک کر دیکھا تو بادلوں میں سے سورج اپنی آنکھیں مل کر جاگ رہا تھا۔ سورج کی آنکھیں کھلیں تو سارا اجڑا شہر جگمگا اٹھا۔ ہر چیز جو اندھیرے کے پردے میں چھپی تھی۔ صاف نظر آنے لگی۔ وہ کمرہ بھی جس میں بچھے پلنگ پر وہ کپڑوں کو بغل میں دبائے لیٹا تھا۔

دن کی روشنی میں اس نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ گھر کا بیڈروم دکھائی دیتا تھا۔ دیواریں بارش کے پانی کی بوچھاڑ سے گیلی ہوگئی تھیں۔ دیواروں پر لگے تصویروں کے فریم ٹوٹے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں اس کمرے میں کتنی بارشوں اور طوفانوں نے بسیرا کیا تھا۔ ہر چیز اپنی اصل کھو چکی تھی۔ اور کوئی اور ہی روپ لیکر کمرے میں پڑی تھی۔ بک شلیف کی ایک الماری کے سارے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ شلیف میں ٹیڑھی میڑھی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ کتابیں دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں مل کر ایک بار پھر شلیف کی طرف دیکھا۔ اور کپڑوں کو ایک طرف پھینک کر پلنگ سے نیچے اترا اور بک شلیف کے پاس آگیا اور تیزی سے کتابیں دیکھنے لگا۔ گھر کا مالک کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مختلف علوم پر کتابوں کی COLLECTION دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ایک کتاب کی گرد جھاڑ کر اس نے کتاب کو غور سے دیکھا تو وہ چونک گیا۔ کتاب کے ورق بوسیدہ اور پھٹ چکے تھے مگر جلد اور پہلے کچھ صفحات

ابھی باقی تھے۔ اس نے پہلے صفحے پر نظر ڈالی تو وہ کتاب کا نام پڑھ کر چونک گیا۔

"THE STORY OF MAN"

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ اور وہ کھڑا ہو کر زور سے چلایا۔

"یہ کتاب میں نے لکھی ہے۔ یہ کتاب میں نے لکھی ہے" وہ اتنے زور سے چلایا کہ اسکی آواز کافی دیر تک اجڑے گھر میں گونجتی رہی۔ اس نے روتی ہوئی آنکھوں سے کتاب کو دیکھا پھر پاگلوں کی طرح بار بار کتاب کو چومنے لگا اور پھر اپنے سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگا۔ روتے روتے جب وہ تھک گیا تو اس نے کتاب کو ایک نظر پھر دیکھا اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا ---- یہ اس کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تھا۔ جب یہ چھپا تو پورے ملک میں دھوم مچ گئی (ANTHROPOLOGY) کے سکالرز نے اسے سال کی بہترین کتاب قرار دے دیا۔ اس کتاب کو بے شمار انعامات ملے۔ اس نے جنت سے آدم اور حوا کی بے دخلی سے لیکر عہد جدید تک آدمی کی جدوجہد' ذہنی' تہذیبی' فکری' معاشرتی اور جنسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا تھا۔ نقادوں کا خیال تھا کہ انسان کی سرگزشت پر شاید یہ آخری اور سب سے اچھی کتاب ہے۔

یہ کتاب اس کے لئے بڑی نیک شگون ثابت ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا ایک خلاء اس کتاب نے پر کیا تھا۔ کتاب پر نیشنل ادبی انعام لیکر وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو اس کی گاڑی کے پاس ایک نہایت خوبصورت لڑکی پنک ساڑھی میں ملبوس کھڑی تھی۔

اسے دیکھ کر وہ لڑکی مسکرائی اور کہنے لگی۔

"میں آپکی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ آپ نے برا تو نہیں منایا۔"

وہ لڑکی کے ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو کر بولا۔

"آپکی اس بات کا جواب تو یہ گاڑی ہی دے سکتی ہے۔ میں تو اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں۔"

لڑکی چونک کر بولی

"بدقسمتی۔"

"ہاں بدقسمتی" ۔ وہ بول "سوچ رہا ہوں۔ میں گاڑی کیوں نہ ہوا۔ چند لمحے آپکی قربت ہی نصیب ہوجاتی ہے۔"

لڑکی یہ بات سن کر کھکھلا کر مسکرائی۔ تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہوٹل کے لان میں نہیں کوہ طور پر کھڑا ہے۔ اور حسن حقیقی نے اپنے چہرے سے نقاب سرکا دی ہے۔ لڑکی نے اسے اپنی طرف پوری طرح متوجہ پایا تو وہ ذرا سنبھلی اور کہنے لگی۔

" میرا نام پنکی ہے۔ میں ویمن کالج میں انگریزی ادب پڑھاتی ہوں۔ اتنی اچھی کتاب لکھنے پر داد دینے کے لئے آپکی گاڑی کے پاس کھڑی آپ کا انتظار کررہی تھی"۔ دوسرے دن وہ اس کے کالج کے باہر گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پنکی مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی

"ارے آپ!۔ کیسے آئے۔؟"

"میری یہ گاڑی ساری رات ایک ہی بات کی رٹ لگاتی رہی ہے۔"

"کونسی بات" پنکی نے اسکی بات کاٹ کر کہا۔

"ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس" وہ مسکرا کر بولا۔ پنکی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

"اگر ہر رات گاڑی کو یہی مرض لاحق رہا تو آپ کا تو کباڑہ ہوجائے گا۔"

"تو پھر" وہ بولا "کچھ ہونا چاہیئے۔"

"اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔" پنکی نے مسکرا کر کہا۔ پنکی ایک ماہ تک سوچتی رہی۔ ایک دن پنکی کو اس نے فون کیا۔

"میری گاڑی پوچھتی ہے۔ سوچنے کا کوئی حل نکلا۔"

"ہاں ۔ نکلا"

"کیا" وہ بولا۔

"میں آپ سے شادی کر رہی ہوں۔"

پھر پنکی نے اس سے شادی کرلی۔

اس کے آنسوؤں نے کتاب پر جمی ساری گرد دھو دی تھی اس نے کتاب کو پیار سے ایک دو بار چوما اور بغل میں دبا لیا۔ کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ ٹوٹی میز کے نیچے رکھے صندوق پر اس کی نظر پڑی تو وہ اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ صندوق میں تالا پڑا ہوا تھا۔ کونے میں رکھی ایک اینٹ اٹھا کر تالہ توڑا۔ صندوق کھولا تو وہ کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ صندوق میں مردانہ کپڑے زیادہ تھے۔ قمیض۔ گرم سوٹ' ٹائیاں اور جرسیاں' اس نے ایک قمیض پہن کر گرم سوٹ پہن لیا اور دو جرسیاں نکال کر پلنگ پر رکھ دیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک کونے میں ایک بڑا تھیلا ایک کیل پر جھول رہا تھا۔ اس نے تھیلا اتارا اور اس کی ساری چیزیں فرش پر انڈیل دیں۔ عورتوں کے استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ایک ڈھیر اس کے سامنے پڑا تھا۔ لپ سٹک۔ کاجل کی ڈبیہ' رنگ برنگے دھاگے۔ پلکیں سنوارنے کی چھوٹی چھوٹی قینچیاں۔ آئی برو بنانے کی پنسلیں۔ اس نے تھیلے میں سب سے پہلے چوم کر اپنی کتاب جرسیاں اور ایک قمیض رکھی اور تھیلا کاندھے پر لٹکا کر باہر نکل گیا۔ سوٹ اس کے ماپ کا نہ تھا اس کے ہاتھ لمبے بازوؤں میں چھپ گئے تھے اور پینٹ بار بار اس کی کمر سے کھسک رہی تھی۔ اس نے دو ایک بار پینٹ کو اوپر کیا مگر پینٹ اس کی کمر پر ٹھہرتی نہیں تھی۔ وہ پلٹ کر مکان میں گیا صندوق میں سے ایک ٹائی نکال کر اپنی کمر کے اردگرد لپیٹ کر گانٹھ دے دی اور ایک طرف چلنے لگا۔

"اب کہاں جانا چاہیے۔"

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

یہ سوال سات سالوں میں وہ اپنے آپ سے ہزاروں بار کر چکا تھا مگر اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بس خاموشی سے جواب دئے بغیر منہ اٹھا کر ایک طرف

چل دیتا تھا۔ اس بار بھی اس نے ایسا ہی کیا اور تیزی سے اس راستے پر چلنے لگا جو شہر سے باہر جاتا تھا۔ شہر کے کھنڈرات ختم ہوئے تو میدانوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جن میں اگی گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے زمین پر گھاس کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ کھیتوں میں کھلے خود رو سفید' پیلے اور سرخ پھولوں کے چہرے رات کی بارش سے لش لش کر رہے تھے۔ گھاس کٹنے کے لئے تیار کھڑی تھی مگر تاحد نظر کوئی کاٹنے والا اور گھاس کھانے والا نہ تھا۔ اس نے ایک پھول توڑ کر اپنے کوٹ کے کالر میں ٹانکا اور پھر درختوں کے جھنڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جس کے ساتھ والے باغ سے اس نے کل پیٹ بھر کر پھل کھائے تھے باغ کے ساتھ بہتی نہر کے پاس جاکر اس نے تھیلا کنارے پر رکھا۔ کپڑے اتارے اور نہر میں چھلانگ لگادی۔ نہر کا پانی صاف شفاف تھا۔ بالکل آئینے کی طرح ۔ نہر کے کنارے بنے شہروں اور چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں انسانوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہر کے پانی میں غلاظت کون گھولتا۔ اس نے سوچا کہ نہر کے پانی کے دل میں بھی خیال آتا ہوگا کہ وہ سب کہاں گئے جو اپنے تن کا میل اس میں آکر گھولتے تھے۔ اس نے محسوس کیا جیسے نہر کا پانی بازو پھیلا کر اسے سمیٹ رہا تھا۔ لہریں اچھل اچھل کر اس کا جسم چوم رہی تھیں۔ وہ بڑی دیر نہاتا رہا پھر نہر سے باہر نکلا کپڑے پہنے اور باغ میں داخل ہوگیا۔ درختوں کی ٹہنیاں مالٹوں اور امرودوں سے جھکی ہوئی تھیں۔ شاخوں پر پھلوں کی اتنی کثرت اس نے آباد دنیا کے زمانے میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھل ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ مالٹے اور امرود اٹھائے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانے لگا۔ جب پیٹ بھر گیا تو تھیلے میں سے اس نے اپنی کتاب نکالی۔ تھیلا سرہانے رکھا اور لیٹ کر اپنی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دوچار ورق پڑھے اور پھر کتاب سینے پر رکھ کر سوچنے لگا کہ اس نے اس کتاب کے ایک ایک لفظ پر کتنی محنت کی تھی۔ اسے یاد ہے اسکی ایک شاگرد نے کلاس میں اس سے پوچھا تھا۔

"SIR۔ آپ آدمی کی کہانی لکھ رہے تھے۔ کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی۔"

"نہیں" اس نے جواب دیا تھا۔

"تین سال ہو گئے SIR۔" لڑکی نے حیران ہو کر کہا تھا۔

"ہاں ۔ مجھے پتہ ہے۔ میں یہ کتاب بہت محنت سے لکھ رہا ہوں۔ جس طرح شہد کی مکھی ایک ایک پھول سے شہد اکٹھا کرتی ہیں۔ میں اسی طرح آدمی کے بارے میں ایک ایک خوبصورتی ڈھونڈ کر اس کی کہانی سجا رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

پھر سات سال میں اس نے انسانی تہذیب کے مختلف ادوار سے ساری خوبصورتیاں چن کر اس کتاب میں سجا دیں جسے سینے پر رکھے وہ درخت کے نیچے لیٹا تھا۔ وہ بہت دیر پرانی یادوں کے جزیروں میں گھومتا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھی کتاب پر دھرے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اچانک ایک مالٹا جھکی شاخ سے اس کے ماتھے پر گرا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ مالٹا ماتھے سے اچھل کر اس کے سینے پر آ کر رک گیا۔ اس نے مالٹا اٹھا کر دور پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔

"اب چلنا چاہیئے"۔

کے اندر سے آواز آئی۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہاں چلنا چاہیئے۔"

اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"مجھے نہیں پتہ ۔ میں نے ۲۰ سال کالج میں لڑکوں کو پڑھایا ہے۔ انہیں منزل تک پہنچایا ہے مگر آج مجھے کوئی بتلانے والا نہیں کہ میری منزل کہاں ہے۔"

اپنے اندر کی آواز کو یہ جواب دے کر وہ چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے وہ راستہ ڈھونڈ رہا ہو جو اسکی منزل کی طرف جاتا ہو۔ مگر سوائے چاروں طرف بکھرے پلوں کے اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا وہ اٹھا اور پھلوں کو اٹھا کر قطار میں رکھنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے سامنے امرودوں اور مالٹوں کی چار قطاریں بنالیں۔ ایک نظر ڈال کر قطاروں کا جائزہ لیا جو قطار ٹیڑھی تھی اسے

سیدھا کیا۔ جب یہ کام کر چکا تو دوڑ کر ادھر ادھر سے بکھری اینٹیں اٹھالایا اور قطاروں کے بالکل سامنے اینٹیں رکھ کر بیٹھنے کے لئے ایک نشست بنالی ۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر ایک لہر سی دوڑ رہی تھی۔ اس نے قطاروں اور اینٹوں کی نشست کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور پھر اینٹوں کی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھیلے کے پاس رکھی کتاب اٹھائی۔ کوٹ کے تینوں بٹن بند کئے۔ قطاروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے سارے پھل لڑکے اور لڑکیاں نظر آئے۔ جو ایک کمرے میں بیٹھے اپنے کاغذ درست کر رہے تھے۔ ایک لڑکی جو سب سے خوبصورت اور ذہین نظر آتی تھی۔ اپنی سیٹ سے اٹھی اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولی ۔

"آپ کے اس لیکچر میں ایک بات قابل وضاحت ہے SIR ۔"

"کون سی بات" اس نے اپنے کاغذات فائل میں رکھ کر پوچھا۔

"غاروں میں ننگا رہنے والا انسان وحشی درندوں کی طرح تھا۔ بالکل غاروں کے پتھروں کی طرح سخت مگر اس عہد میں بھی اس نے ادب تخلیق کیا۔ شاعری کی۔ پتھروں پر عورتوں اور دیوتاؤں کی تصویریں بنائیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے وحشی پن سے (SOFT) جذبات کی پھوار برسے ---"

"یہ ممکن ہے" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مگر کیسے سر" لڑکی بولی۔

"یہ سب کچھ محبت اور دوستی کے اس جذبے سے ممکن ہوا جو اس کے وحشی پن میں کہیں نہ کہیں سانس لے رہا تھا۔ اس عہد کا ہر شخص تو شاعر نہیں تھا مگر یہ دونوں جذبے اس عہد میں بھی ان کے دلوں میں موجود تھے بہت سے لوگ ان سے بے خبر تھے۔ جن لوگوں نے ان جذبات کی آواز سن لی۔ وہ شاعر اور ادیب بن گئے ------ تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں۔" اس نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی اس کے اس سوال سے گھبرا گئی۔ اور کہنے لگی "ٹیکسٹائل کا کام کرتے ہیں۔ دو فیکٹریاں ہیں ان کی ۔"

"ہومر اور گوئٹے پسند ہیں انہیں۔"

"بالکل نہیں۔" لڑکی بولی "انہیں وقت ہی نہیں ملتا۔ کاروبار سے۔"

"تمہیں پسند ہیں"

"آف کورس سر۔ میں لٹریچر میں ماسٹر کر رہی ہوں۔" لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"بس جو فرق آج کے عہد کے انسانوں میں ہے یہی فرق غاروں کے زمانے میں بھی تھا۔ کچھ مار دھاڑ میں مصروف رہے۔ کچھ شکار کرنے میں۔ کچھ عورتوں کا ریوڑ اکٹھا کرنے میں مگر ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے گیت لکھے۔ کہانیاں کہیں' دیواروں پر تصویریں بنائیں اور آنے والے عہد کی جھولی میں ڈال دیں۔"

پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گیا۔ اس کے سامنے کوئی لڑکا تھا نہ کوئی لڑکی۔ بس پھلوں کی چار قطاریں تھیں جن کے سامنے وہ اینٹوں کی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر گلہ صاف کیا اور پھلوں کی قطاروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"پہلا انسان اس زمین پر کب آیا۔ کسی کو نہیں پتہ۔ کوئی کہتا ہے۔ دس لاکھ سال۔ کوئی کہتا ہے ۵ لاکھ سال' کوئی کہتا ہے، ۲۰ ہزار سال، مگر یہ سب مفروضے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ قطار میں پڑے پھل جوں کے توں پڑے تھے۔ بالکل سعادت مند اور مودب طالب علموں کی طرح۔ جو ہمہ تن گوش استاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ دور امرودوں کی شاخ پر دو طوطے کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اس نے ایک مالٹا اٹھا کر اس درخت کی طرف اچھالا۔ دونوں طوطے اڑ گئے اور وہ دوبارہ پھلوں کی کلاس سے مخاطب ہوا۔

"سب اس بات سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس بحث کو چھوڑیئے کہ آدمی کب دنیا میں آیا مگر ایک بات پر سب متفق ہیں کہ خدا نے یہ زمین اور اس پر نظر آنے والی سب چیزیں سات دن میں بنائیں۔"

اچانک اس کے پیچھے سے آواز آئی۔

"اور آدمی نے یہ سب کچھ سات گھنٹوں میں تباہ کردیا۔"

وہ اس آواز کو سن کر یک دم رکا اور حیران ہو کر دائیں بائیں اور سامنے دور تک نظر دوڑائی مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ وہ چند لمحے یوں ہی حیران رہا اور پھر بولا۔

"یہ میرا وہم ہے۔ یہاں کوئی نہیں۔ کون ہو سکتا ہے سوائے میرے۔"

یہ کہہ کر پھلوں کی قطاروں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ خدا نے یہ زمین اور اس کی ساری چیزیں سات دن میں بنائیں ---------"

اچانک اس کے پیچھے سے وہی گرج دار اور بھاری آواز آئی۔

"اور انسان نے یہ سب کچھ سات گھنٹوں میں تباہ کردیا۔"

اس بار وہ چونکا ضرور مگر فوراً گردن موڑ کر آواز کی سمت پیچھے دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

اس کے پیچھے درخت کے پاس ایک گدھا کھڑا تھا۔ سفید رنگ کا موٹا تازہ گدھا اپنے دونوں کان ہلا کر اس کی حیرانی کا استقبال کررہا تھا۔ وہ اینٹوں کی نشست سے اٹھا اور گدھے کے قریب جاکر رک گیا اور پھر گدھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"یہ تمہاری آواز تھی۔"

گدھے نے اپنے اگلے دائیں پیر سے زمین کو کریدنا شروع کردیا۔ گدھے کی یہ حرکت دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

"میں بھی پاگل ہوں۔ بھلا گدھا بھی کبھی بول سکتا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور پھر کہنے لگا۔

"مگر یار۔ تم بولو یا چپ رہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں بانہیں گدھے کے گلے میں ڈال دیں جیسے مدتوں بعد کوئی عاشق اپنے بچھڑے محبوب سے گلے مل رہا ہو۔ گدھے کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا

اور کہنے لگا۔

"ادھر سامنے آکر بیٹھو۔"

گدھا اس کی بات سن کر مالٹوں اور پھلوں کی قطاروں کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی اینٹوں کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی کتاب گدھے کو دکھا کر کہنے لگا۔

"یہ کتاب میں نے لکھی ہے مگر تمہیں اس کی اہمیت کا کیا پتہ۔ یہ میری ۲۵ سال کی تحقیق کا پھل ہے۔ یہ کتاب چھپی تو ادبی دنیا میں طوفان آگیا تھا۔ بڑے بڑے سکالرز اور عالموں کے طوطے اڑ گئے تھے کتاب دیکھ کر۔"

اس نے کتاب کو دیکھا اور پھر کتاب چوم کر گدھے سے کہنے لگا۔

"مجھے ادب کا سب سے بڑا قومی انعام ملا تھا اس کتاب پر۔" گدھے نے اپنے دونوں کان پھڑپھڑائے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ پروفیسر نے اپنی گفتگو سے لاتعلق گدھے کو غور سے دیکھا جو آسمان پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ کالے گہرے بادل۔ اسے فوراً" شیخ سعدی کی وہ حکایت یاد آگئی جس میں ایک کمہار نے بادشاہ سے کہا تھا کہ میں موسم کا پورا پورا حال بتلا سکتا ہوں "کیسے" بادشاہ نے پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی موسمی آلہ ہے۔"

"نہیں" کمہار نے کہا۔ "مجھے موسم کے بارے میں میرا گدھا بتلاتا ہے۔"

"گدھا" بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بادشاہ سلامت گدھا" کمہار نے بڑی عقیدت سے جواب دیا۔

"مگر کیسے" بادشاہ نے پوچھا۔

"جب میرا گدھا آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں کان پھڑپھڑائے تو بارش ضرور ہوتی ہے۔ اگر اس کے کان نیچے لٹک جائیں تو بارش نہیں ہوتی۔" کمہار نے کہا۔

یہ پوری حکایت اس کے ذہن میں گھوم گئی۔ اس نے گدھے کی طرف دیکھا۔

گدھے نے ایک بار پھر کان پھڑپھڑائے اور کھڑا ہوگیا۔ گدھے کو کھڑا دیکھ کر وہ بھی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔

"مجھے پتہ ہے بارش آنے والی ہے۔ رات بھی زور کی بارش ہوئی تھی مگر گھبرانے والی کوئی بات نہیں جہاں میں رات تھا۔ وہیں آج رات بھی قیام کریں گے"۔ یہ بات کہہ کر اس نے گدھے کے قریب جا کر کہا۔

"مگر یار ایک بات ہے۔ میں تمہیں کیا کہہ کر پکاروں" چند لمحے سوچا اور پھر کہنے لگا۔

"ساتھی کیسا رہے گا۔"

گدھے سر جھکائے کھڑا رہا جیسے کہہ رہا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے تمہاری مرضی۔"

"ٹھیک ہے ساتھی ٹھیک رہے گا۔" وہ گدھے کے سر پر تھپکی دے کر بولا۔

"اب زندگی کے باقی دن ہم دونوں اکٹھے گزاریں گے ساتھی۔ جو پہلے مرا اس کی قبر پر زندہ ساتھی پھول رکھے گا۔"

ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک آسمان پر اتنی زور سے بجلی چمکی کہ ساری زمین لرز گئی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ بادل اتنی زور سے گرجا کہ درختوں کی شاخوں پر لگے پھل زمین پر دانوں کی طرح بکھرنے لگے۔ گدھے نے اور اس نے بجلی کی دھمک سے جانا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ گدھا اچھل کر ایک بوڑھے برگد کے درخت کے پاس جاگرا اور گدھے کے پیروں کے پاس پروفیسر۔ اس کی کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ فاصلے پر جاگری۔ پروفیسر نے جلدی سے کتاب کو دبوچا اور دور پڑے تھیلے کی طرف لپکا اور کتاب جلدی سے اس میں ٹھونس دی۔ بجلی کی کڑک کے بعد فوراً بارش شروع ہوگئی۔ موسلا دھار بارش۔ گدھا اور پروفیسر دونوں دیکھتے ہی دیکھتے شرابور ہوگئے۔ اس نے اپنی ڈھیلی پتلون (جو نیچے کھسک رہی تھی) اوپر پیٹ کی طرف کھینچی اور گدھے سے بہت جلدی میں بولا۔

"ساتھی ۔ یہ بارش نہیں طوفان ہے طوفان ۔ جلدی سے بھاگو۔ ورنہ بے موت مارے جائیں گے چلو جلدی کرو اور میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے جس راستے سے آیا تھا بھاگنا شروع کر دیا۔ گدھا شاید اس کی اس بات کا منتظر ہی تھا۔ فوراً" سرپٹ دوڑنے لگا۔ بارش اور تیز ہوا نے چاروں طرف پانی کی چادریں تان دی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ آخری بارش تھی سارا پانی آج ہی زمین پر برس جائے گا۔ گدھا بہت تیز بھاگ رہا تھا۔ پروفیسر کی رفتار بھی کچھ کم نہ تھی مگر اس کی تیز دوڑ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی پتلون بن رہی تھی جو بار بار پیٹ سے کھسک کر نیچے گر رہی تھی اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ رکا اور پتلون اتار کر اپنے کندھے پر رکھ لی۔ گدھا آگے نکل گیا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کا ساتھی رک گیا ہے تو وہ بھی رک گیا۔ پروفیسر کو پتلون اتارتے دیکھا تو منہ دوسری طرف کر لیا۔ چند لمحے بعد پروفیسر دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا اور گدھے سے کہنے لگا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آؤ۔"

دونوں پھر بھاگنے لگے۔ برباد بستی سے باغ کا فاصلہ کچھ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ لیکن بارش اور تیز طوفان بار بار رکاوٹ بن رہا تھا مگر وہ دونوں پھر بھی بھاگ رہے تھے۔ اسے بھاگتے بھاگتے سالانہ کالج سپورٹس کی سٹاف ریس یاد آگئی۔ کالج کا پورا سٹاف دوڑنے کے لئے سٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑا تھا۔ بس وہ اکیلا پرنسپل کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی چہیتی گرل سٹوڈنٹ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"سر آپ دوڑ میں حصہ نہیں لے رہے۔"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"مگر کیوں سر" لڑکی بولی۔

"اس لئے کہ میں بہت سست رفتار ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ایک انعام سست رفتاری کا بھی تو ہے۔" پرنسپل نے مسکرا کر

کہا۔ آخر لڑکیوں کے پرزور اصرار پر اسے دوڑ میں حصہ لینا پڑا اور وہ دوڑ میں اول آ گیا۔

اس دن اس نے پتلون پہنی ہوئی تھی مگر آج پتلون اس کے کاندھے پر تھی اور وہ دوڑ رہا تھا۔ دونوں کھیتوں اور درختوں کے جھنڈ عبور کر کے آخر ویران گھروں کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے دوڑتے دوڑتے اس گھر کو پہچانا جس میں اس نے رات بسر کی تھی اور اندر داخل ہوگیا اور اس کے پیچھے اس کا ساتھی گدھا۔ ابھی اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا۔ کمرے کی ساری چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے پلنگ پر اپنا تھیلا رکھا۔ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا مگر پلنگ ابھی تک محفوظ تھا۔ مری ہوئی چمگادڑوں کو صبح اس نے جانے سے پہلے بستر سے ہٹادیا تھا۔ اس نے پتلون پلنگ کے ایک کونے پر پھیلا دی اور گدھے سے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اپنا ٹھکانہ اسی جگہ بنالو۔ رات اس الماری میں بہت چمگادڑیں تھیں۔ بہت سی مرگئی ہیں۔ کچھ اب بھی ہوں گی مگر کیا فرق پڑتا ہے۔''

گدھا اسکی بات سن کر ربوٹ کی طرح چلتا ہوا الماری کے پاس پہنچا اور بیٹھ گیا۔ پروفیسر گرد آلود پرانے پلنگ پر لیٹ گیا اور گدھے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

وہ گدھے کے آنے سے بہت خوش تھا اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی تنہائی ختم ہوگئی ہے۔ اس نے کروٹ بدلی اور کہنی پر اپنا چہرہ ٹیک کر گدھے سے بولا۔

''ساتھی تمہیں شاید احساس نہیں کہ تمہیں مل کر میں کیسا محسوس کر رہا ہوں۔ بالکل داستان کے اس ہیرو شہزادے کی طرح جو آب حیات لینے محل سے نکلے اور اسے آب حیات مل جائے۔ تمہارا چہرہ مجھے بالکل اپنے دوست کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ ناصر بالکل تمہاری طرح تھا۔''

ناصر کا نام لے کر اس نے آنکھیں بند کرلیں کتنا معصوم۔ بھولا اور سیدھا آدمی تھا اس کا دوست ناصر۔ ایک دفعہ چلتے چلتے فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے ٹکرا گیا۔ گرگیا۔ اٹھا اور کھمبے سے معذرت کی اور Iam SORY کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ لیٹا

لیٹا زیرِ لب مسکرایا۔ آنکھیں کھول کر گدھے سے کہنے لگا۔

”ناصر کو سب لوگ بدھو کہتے تھے۔ ہر شے سے بے خبر۔ نہ کپڑوں کا دھیان نہ کھانے کی پرواہ ۔ بس ہروقت آسمان کو دیکھ کر کچھ سوچتا رہتا تھا مگر وہ سدا سے ایسا نہیں تھا۔ اسکی یہ حالت اس کے باپ نے بنائی تھی“

پھر وہ آنکھیں بند کر کے ناصر کے باپ کی جنسی کمینگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ناصر کا باپ بہت فضول آدمی تھا۔ چار شادیاں کر کے بھی اس کی نیت نہیں بھری تھی۔

پروفیسر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور گدھے کو مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”جانتے ہو ناصر کے باپ نے کیا کیا ناصر کے ساتھ ------ سنو۔“

وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

” ناصر کو یونیورسٹی میں ایک لڑکی فریدہ سے بے حد محبت ہو گئی۔ ناصر نے اپنے باپ سے اپنے عشق کا پورا قصہ کہہ دیا۔ باپ نے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس میں فکر کی کیا بات ہے بیٹے تم اس کے گھر کا پتہ دو۔ میں کل ہی جا کر فریدہ کے باپ سے بات کر لیتا ہوں۔“

ناصر نے فریدہ سے بات کی کہ میرے والد کل تمہارے گھر آ رہے ہیں۔ فریدہ نے کہا کہ ٹھیک ہے میرے والدین بھی چاہتے ہیں۔ کہ تمہارے والد گھر آ کر میرا رشتہ مانگیں ۔ ناصر کا باپ دوسرے دن فریدہ کے گھر گیا۔ فریدہ کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک گئی۔ فریدہ کے والدین سے کہنے لگا۔

”میرا بیٹا ابھی زیرِ تعلیم ہے ۔ دو سال بعد ایم ۔ اے کرلے گا۔ نوکریوں کا ملک میں سخت قحط ہے پتہ نہیں اسے نوکری ملے یا نہ ملے۔ جبکہ آپ چاہتے ہیں کہ آپکی بٹی جلد از جلد اپنا گھر بسائے۔“

فریدہ کے والدین نے ناصر کے باپ کی بات پر گردن ہلائی تو ناصر کا باپ بولا ۔

”جوتوں کی فیکٹری میں سیلز میجر ہوں ۱۵ ہزار تنخواہ ہے‘ گھر‘ گاڑی ‘ حیثیت سب

کچھ ہے میرے پاس۔ میرے بیٹے کے پاس کیا ہے وہ تو ابھی خود مجھ سے ہر ماہ پاکٹ منی لیتا ہے۔"

فریدہ کے والدین کو یہ بات بھا گئی اور فریدہ کی شادی ناصر کے باپ سے کردی۔ بس اس دن سے ناصر ہر چیز سے بے خبر ہوگیا۔ اور ایک دن چپکے سے خودکشی کرلی۔"

ساری کہانی سنا کر اس نے گدھے کی طرف دیکھا تو وہ ہر شے سے بے نیاز بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر گدھے کی طرف دیکھا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے زنانے کپڑوں کا وہ ڈھیر جو وہ صبح پلنگ پر چھوڑ گیا تھا اپنے سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ ایک عرصے کے بعد وہ اتنا مسلسل بولا تھا۔ اس کے ہونٹ بول بول کر خشک ہوگئے تھے اور معدہ خالی مگر اس کے باوجود وہ چند لمحوں بعد سوگیا اور خراٹے لینے لگا۔

ایک عرصے کے بعد گدھا کی ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز اس کے کان میں پڑی تھی۔ گزرے دنوں میں وہ یہ آواز سنتا تو شاید اسے بری لگتی مگر اجڑے گھر کے ٹوٹے اور گرد آلود پلنگ پر اسے یہ بڑی بھلی لگی بالکل ایسے جیسے کوئی کلاسیکل موسیقی کا ماہر استاد راگ آسا نچلے سروں میں گا رہا ہو۔ وہ آنکھیں بند کرکے گدھے کی آواز سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو گدھا اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

"اٹھ گئے ساتھی۔" اس نے گدھے سے آنکھیں مل کر کہا۔ اور پھر اٹھ کر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میں نے تمہارے بغیر ساری راتیں بے چینی میں کاٹی ہیں مگر کل رات بہت آرام سے کٹی۔ میں بہت بے خبری کی نیند سویا۔ تمہاری موجودگی نے میری تنہائی ختم کردی ہے۔"

گدھا اس کی یہ بات سن کر باہر جھانکنے لگا۔ دروازے میں سے اس نے دیکھا گھاس کا ایک گھنا جنگل سا نظر آیا۔ وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔ گدھے کے باہر جانے

کے بعد وہ پلنگ سے نیچے اترا اور ایک کمرے میں چلا گیا جس کا دروازہ چمگادڑوں کی الماری کے بالکل ساتھ تھا۔ اس کے اندر جاکر اندازہ لگایا کہ یہ باورچی خانہ ہوگا۔ دو ایک الماریوں میں کچھ برتن اوندھے پڑے تھے۔ اس نے مختلف ڈبوں اور کنستروں کی تلاشی لی مگر کھانے کی کوئی چیز نہ مل سکی۔ اسے چمچ اور کانٹے نظر آئے۔ کٹلری کا سارا سامان زنگ آلود تھا۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ ایک چھری نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور پھر دوسرا دراز کھولنے لگا۔ دراز کی لکڑی پھول چکی تھی اسے دراز کھولنے میں بڑی دقت محسوس ہوئی مگر اس نے دراز کھول ہی لی۔ دراز میں گھریلو استعمال کی بے شمار چیزیں پڑی تھیں ان میں ایک چھوٹا سا پیکٹ بھی تھا۔ اس نے اس پیکٹ کی گردن جھاڑی تو اسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں یہ ماچسوں کا پیکٹ تھا۔

پروفیسر ماچسوں کو دیکھ کر پہلے حیران اور پھر بے حد خوش ہوا۔ فرط مسرت سے اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ آنکھیں پھیل گئیں اور وہ زور سے چلایا۔

"ساتھی۔ اب میں نہیں مرسکتا۔"

اور پیکٹ لے کر کمرے سے باہر آگیا جہاں گدھا گھاس کھا رہا تھا۔

"دیکھو ساتھی۔ ماچیس۔ آگ جلانے والی ماچیس میری بھوک اور سردی کا علاج مجھے مل گیا ہے۔ اب میں نہیں مرسکتا۔" یہ کہہ کر اس نے خوشی میں ناچنا شروع کردیا۔ ناچتے ناچتے سامنے ٹوٹی دیوار پر کوئی چیز دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔

اس نے دیکھا سامنے دیوار پر ایک سفید فاختہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ کہاں سے آگئی" اس نے فاختہ کو دیکھ کر کہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور اس نے خاموشی سے زمین پر پڑا ہوا ایک پتھر اٹھالیا۔ گدھے کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نشانہ باندھ کر پتھر فاختہ کے سر پر دے مارا فاختہ اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھی بیٹھی رہی۔ پتھر اس کے سر پر لگا اور وہ چکرا کر زمین پر آگری اور جان دے دی۔ وہ بھاگ کر گیا اور فاختہ اٹھالی۔ چھری سے پر صاف کئے اور اندر چلا گیا۔ اندر جاکر فاختہ کو پلنگ پر رکھا اور چاروں

طرف دیکھنے لگا۔ زنانے کپڑوں کے ڈھیر سے دو تین شلواریں فرش پر رکھیں، ٹوٹی کرسی کا ایک حصہ ان پر رکھا اور زمین پر بیٹھ کر ماچس جیب سے نکال کر جلانے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ماچس ٹھیک سے جل نہیں رہی تھی۔ ماچس کی ڈبیہ پر لگا مصالحہ بہت پرانا اور نم آلود تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس کے ذہن میں ایک خوف نے سر اٹھایا اور بولا۔

"اگر آگ نہ جلی"

اس نے اس دھیمی آواز پر کوئی دھیان نہ دیا اور مسلسل ماچس کی تیلیاں ماچس کی ڈبیہ پر رگڑتا رہا اور پھر ایک تیلی جل گئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس سے پہلے کہ ماچس کی تیلی بجھے۔ تیلی کو کپڑوں کے قریب لے گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ آگ کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی خوشی۔ حیرانی اور بے تابی تھی جو شاید صدیوں پہلے اس آدمی کے چہرے پر تھی جیسے یونانی دیوتا پرومیتھی لیس (   ) نے پہلی بار انسان کو کنول پھول کے ڈنٹھل میں آگ چھپا کر دی تھی۔

جب آگ نے کرسی کی لکڑی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہ چونکا اور پلنگ سے فاختہ اٹھا کر آگ میں پھینک دی۔ چھری جیب سے نکال کر اس نے فاختہ کو دائیں بائیں پلٹا۔ اس نے برسوں بعد گوشت کی شکل دیکھی تھی۔ اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا معدہ پیٹ کی نچلی تہہ سے اچھل کر اس کی زبان پر آگیا ہے۔ اس سے اور دیر برداشت نہ ہوا اور فاختہ کا کچا کچا گوشت آگ سے نکال لیا۔ بے تابی اور بے صبری سے اپنے دانت گوشت میں گاڑھ دیئے۔ گوشت گرم تھا۔ اس کی زبان، ہونٹ اور حلق میں شدید جلن ہوئی مگر وہ وحشی کتوں کی طرح گوشت کو نوچتا رہا۔ گدھا دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آدمی کا معصوم فاختہ کے گوشت پر یہ ظلم اس سے برداشت نہ ہوا اور منہ موڑ کر باہر چلا گیا۔ گدھے کو اس نے باہر جاتے دیکھا مگر کوئی دھیان نہیں دیا اور فاختہ کی گردن چباتا رہا۔ پوری فاختہ کھا کر وہ

اٹھا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ تین سال بعد اس کے معدے میں گوشت گیا تھا۔
دیوار پر لگے ٹوٹے آئینے میں وہ اپنا چہرہ دیکھ کر ڈرا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔
ناک، رخسار اور ہونٹوں پر خون کے دھبے تھے۔ اپنی ڈراؤنی شکل دیکھ کر اس نے فوراً"
پلنگ سے ایک کپڑا اٹھا کر اپنا منہ صاف کیا اور کپڑا آگ میں پھینک دیا۔ آگ کے
پاس رکھی چھری اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور آگ کے پاس لیٹ گیا پھر
جلد ہی سو گیا اور خواب دیکھنے لگا۔ آج اس کے خوابوں میں ایک ایسا شہر ابھرا جہاں
چاروں طرف گوشت ہی گوشت بکھرا تھا۔ دیواروں پر گوشت لٹکا تھا ۔ گھروں کے
کمرے گوشت سے بھرے تھے اور وہ اکیلا ہاتھ میں چھری پکڑے گوشت کاٹ رہا تھا
اور کھا رہا تھا۔

رات گئے اس کے پیٹ میں درد کی ایک تیز لہر سی اٹھی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گدھا اس سے کچھ فاصلے پر الماری کے پاس بیٹھا تھا۔ درد کی لہر اس کے پورے پیٹ میں سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور پھر گدھے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تین سال کے بعد معدے نے گوشت کا ذائقہ چکھا ہے۔ شاید ہضم کرنا بھول گیا ہے۔ میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ ذرا دو ایک لمبے چکر لگاؤں گا تو سب ٹھیک ہوجائیگا۔۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور شہر کی ویران سڑک پر دوڑنے لگا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا مگر اس نے پرواہ نہیں کی اور دوڑتا رہا۔ شہر کے مکان اندھیرے میں جن بھوت نظر آرہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مگر اسے دوڑنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اندھیرے کا اب وہ عادی ہوچکا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب وہ شہری حدود سے ذرا باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ رک گیا۔ پیچھے مڑکر دیکھا۔ اس کا ساتھی گدھا اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا آرہا تھا۔ اس نے مسکرا کر گدھے کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"آو ساتھی آو۔ کیسا لگ رہا ہے۔ گئے رات سیر سپاٹا۔" گدھا دوڑتا دوڑتا اس کے برابر آگیا اور پھر دونوں شہر کا ایک چکر لگا کر واپس گھر میں آگئے۔ کمرے میں آکر پروفیسر نے جیب سے ماچس نکالی۔ دو کپڑے فرش پر پھینکے اور آگ جلائی۔ اس بار اس نے تیلیاں ضائع نہیں کیں۔ دو ایک تیلیوں کے نقصان کے بعد شعلہ لپکا اور اس

نے تیلی کپڑوں پر پھینک دی۔ جب آگ نے کمرہ پوری طرح روشن کردیا تو اس نے
جیب سے ماچسوں کا بنڈل نکال کر سامنے رکھ لیا۔ اور ماچس کی ڈبیوں سے ماچس کی
تیلیاں نکال کر گننے لگا۔ ماچسیں کل سات تھیں۔ اس نے ساری تیلیاں فرش پر ڈھیر
کرلی تھیں ہر ماچس کی ڈبیاں میں اس نے سوسو تیلیاں گن کر ڈالیں۔ کل ملا کر ۶۵۰
تیلیاں بنتی تھیں اس نے حساب لگایا اگر وہ ہر روز دو بار آگ جلائے اور کوئی تیلی
ضائع نہ ہو تو وہ ایک سال تک آگ جلا سکتا ہے۔ اس نے ماچس کی ڈبیاں بہت احتیاط
اور سنبھال کر ایک کپڑے میں لپیٹی اور تھیلے میں رکھ لیں۔ پہلے یہی احتیاط اس نے
کتاب کے سلسلے میں دکھائی تھیں مگر ایسا لگتا تھا جیسے ماچس کے مقابلے میں اب کتاب
کی اہمیت ثانوی ہوگئی ہے۔

چمگادڑوں والے گھر میں اس نے اور گدھے نے پانچ چھ دن گزارے۔ ان چھ
دنوں میں اس نے پھل اور ایک چھوٹی سی چڑیا کا گوشت کھایا۔ اور گدھے نے صرف
گھاس۔ ایک صبح اس نے اپنی تھیلا کاندھے پر ڈال کر گدھے سے کہا۔

"چلو ساتھی۔ بہت ہوگیا یہاں۔ کہیں اور چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے
باہر نکل گیا اور اس کے پیچھے گدھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ ایک راستے پر چل دیا۔ یہ
راستہ کہاں جاتا تھا۔ اسے نہیں پتہ تھا لیکن اتنا پتہ تھا کہ یہ راستہ وہ نہیں تھا جس پر
چل کر وہ شہر میں داخل ہوا تھا۔ کچے پکے اس راستے پر جا بجا گھاس اگی ہوئی تھی۔
آمدورفت نہ ہونے کی وجہ سے یہ گھاس بڑی سرسبز اور لمبی لمبی تھی۔ دونوں اس
راستے پر چلتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور پرندوں
کے غول درختوں پر ہنس کھیل رہے تھے۔ پرندوں کو دیکھ کر اس کا ہاتھ بار بار اپنی
جیب میں رکھی چھری پر جارہا تھا۔ اس نے ایک گھنٹہ مسلسل پرندوں کی طرف پتھر
اچھالے مگر کوئی نشانے پر نہ پڑا۔ آخر اس نے گدھے سے کہا۔

"لعنت بھیجو۔ کبھی پھر سہی۔"

چلتے چلتے جب وہ ایک نہر کے پل پر پہنچے تو سورج غروب ہونے کا کچا پکا ارادہ کر

رہا تھا۔ نہر کا شفاف پانی دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ نہالے۔ اپنا تھیلا کنارے پر رکھا۔ کپڑے اتارے اور نہر میں اتر گیا۔ پانی بہت شفاف تھا۔ نہر شاید کسی پہاڑی علاقے کا پانی لیکر آ رہی تھی۔ پتھریلی زمین سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب پہاڑی علاقہ شروع ہونے والا ہے۔ نہر زیادہ گہری نہیں تھی پانی اس کی کمر تک تھا۔ وہ پانی میں چلتا ہوا پل کے نیچے پنچا تو اسکی باچھیں کھل گئیں چھوٹی چھوتی مچھلیوں کا ایک ہجوم ادھر ادھر تیزی کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ وہ پہلے حیرانی سے انہیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا پھر جھک کر مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کی۔ جوں ہی وہ پانی میں ہاتھ ڈالتا مچھلی اس کے ہاتھ سے پھسل جاتی۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر اس نے دو مچھلیاں پکڑ ہی لیں۔ وہ تڑپتی ہوئی مچھلیاں لیکر باہر نکلا۔ گدھا کنارے پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے گدھے کے پاس مچھلیاں رکھ دیں اور خود بھاگ کر سوکھے پتے اور درختوں کی سوکھی شاخیں ڈھونڈنے لگا۔ سوکھی پتلی پتلی شاخیں اور پتوں کا ایک ڈھیر لیکر وہ واپس آیا تو مچھلیاں ابھی تک تڑپ رہی تھیں۔ اس نے پتوں پر لکڑیاں رکھیں اور تھیلے سے ماچس نکال کر جلائی۔ کوٹ کی جیب سے چھری نکالی۔ کمال پھرتی سے دونوں مچھلیاں صاف کیں اور پھر چھری میں پرو کر انہیں آگ پر سینکنے لگا۔ جب مچھلیاں آگ پر اچھی طرح پک گئیں اور ان کا تیل آگ پر ٹپکنے لگا تو اس نے انہیں آگ سے ہٹالیا۔ انہیں تھیلے پر رکھا اور چھری سے کئی ٹکڑے کرلئے اور ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر پھونکوں سے ٹھنڈا کر کے کھانے لگا۔ دونوں مچھلیاں ہڑپ کر کے اس نے گدھے کی طرف دیکھا اور بولا۔

"گوشت کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے اور گوشت بھی پھر مچھلی کا۔ نہ نظام ہضم کا مسئلہ نہ معدے کو غیر ضروری تکلیف۔ اِدھر کھایا اُدھر ہضم۔"

سورج اب تقریباً ڈوب چکا تھا لیکن ابھی مکمل اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر نہر کے دوسرے کنارے کی طرف نظر دوڑائی۔ دور درختوں کے جھنڈ کے ساتھ اسے کچھ مکانات دکھائی دیے۔ اس نے اپنا تھیلا اٹھا کر کاندھے پر رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کاندھے سے تھیلا اتار دیا اور نہر میں اتر گیا۔ پانی میں چلتا ہوا پل کے قریب

گیا۔ بڑی تیزی سے دو مچھلیاں پکڑیں اور باہر نکل آیا۔ مچھلیاں زمین پر پھینک دیں۔ کپڑے پہنے۔ تھیلا کاندھے پر لٹکایا۔ مچھلیاں تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھیں۔ انہیں تھیلے میں ٹھونسا اور گدھے سے کہنے لگا۔

"رات اس گاؤں میں گزاریں گے جو درختوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دے رہا ہے۔ زیادہ دور نہیں۔ پوری طرح اندھیرا ہونے سے پہلے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے۔"

گدھا خاموشی سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اس نے گدھے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں تم پر سواری کروں گا اور تم مجھے چند منٹوں میں وہاں لے جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ گدھے پر بیٹھ گیا مگر گدھا جوں کا توں کھڑا رہا گدھے کو ساکت دیکھ کر وہ بولا۔

"کیوں بھائی چلتے کیوں نہیں۔ اتر جاؤں؟"

گدھے نے اس کی بات سن کر اپنا رخ پھیر لیا اور چلتا ہوا چند قدم پر جا کر رک گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ اسکی کتاب وہاں پڑی تھی جہاں وہ بیٹھا مچھلیاں بھون رہا تھا۔ ماچس کا پیکٹ نکالتے ہوئے اس نے کتاب تھیلے سے نکالی تھی مگر اسے دوبارہ اندر رکھنا بھول گیا تھا۔ پروفیسر اچھل کر گدھے سے اترا اور کتاب اٹھاکر تھیلے میں رکھ لی۔ گدھے کے پاس آیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولا۔

"THANK YOU۔ ساتھی Thank you" یہ کہہ کر دوبارہ گدھے پر بیٹھ گیا اور گدھا پل بھر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کا جھنڈ گزر گیا اور اس کے ساتھ بنا مکانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک ہی طرز کے بنے ہوئے مکان چھوٹے چھوٹے کاٹیج نما گھر تھے۔ ان سے پہلے ایک بڑے سے گیٹ پر ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھے الفاظ بارش' ہوا' آندھی اور برے موسموں کے ہاتھوں مٹ چکے تھے لیکن ماڈل فارم کے الفاظ اب بھی پڑھے جاسکتے تھے۔ اس نے گدھے کو

رکنے کے لئے کہا اور اتر کر بورڈ پر لکھے حروف پڑھنے لگا مگر باوجود کوشش کے صرف ماڈل فارم کے الفاظ پڑھ سکا اور پھر گدھے کو لیکر آگے بڑھ گیا۔ ایک ہی طرز پر بنے گھر اسے بہت پسند آئے۔ گھر اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ گھروں کے دروازے کھلے تھے۔ ان کے سامنے کھڑی موٹر سائکلیں اور دو کاریں بالکل تباہ ہوچکی تھیں ۔ وہ دونوں انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک گھر جو قدرے محفوظ تھا۔ اس گھر کے سامنے وہ رک گیا اور کھلے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا یہ گھر کا غالباً" ڈرائنگ روم تھا۔ ٹوٹی پھوٹی میز کرسیوں اور گرد سے اٹے صوفوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ اندر داخل ہونے لگا تو اچانک گدھے نے اسے زور سے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ اس کے کاندھے سے تھیلا اچھل کر دور جا گرا اور گدھا تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا اور اس سانپ کو اپنے دونوں کھروں سے مار مار کر کچل دیا جو اندر داخل ہوتے ہوئے پروفیسر کے پیروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پروفیسر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اطمنان کا سانس لیا۔ اس کی جان بچ گئی۔ اتفاق سے اسوقت اس نے جوتے بھی نہیں پہنے ہوئے تھے۔ اتار کر ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے تھیلے کے ساتھ پکڑے ہوئے جوتے اٹھائے جلدی سے پیروں میں پہنے اور تھیلا اٹھا کر گدھے کے چلاگیا جو دروازے میں کھڑا تھا اور بولا ۔

"شکریہ ساتھی ۔ جان بچانے کا شکریہ ۔"

گدھے نے کان پھڑپھڑائے جیسے کہہ رہا ہو

"اس کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ گدھے کو تھپکی دے کر کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ہوچکا تھا۔ اس لئے اسے سوائے کرسیوں' میزوں کے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ سنٹر میں رکھی ہوئی میز کے پاس گیا۔ میز پر گرد جمی تھی۔ اس نے اپنے تھیلے سے ماچس نکالی' جلائی اور پھر سامنے پڑے ہوئے صوفے کو دیکھا جس کا کپڑا پھٹا ہوا تھا اور نیچے لٹک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماچس کی تیلی بجھتی اس نے کپڑے کو آگ لگا دی

اور دیکھتے ہی دیکھتے صوفے کا کپڑا جلنے لگا اور کپڑے کے ساتھ لکڑی کو بھی آگ لگ گئی۔ اس نے سوچا کہ یہ آگ کم از کم گھنٹوں جلتی رہے گی اور وہ پورے گھر کا جائزہ لے سکے گا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی ہر شے گرد آلود تھی مگر ابھی تک سلیقے سے پڑی ہوئی تھی۔ الماریاں ان میں رکھی ہوئی چیزیں۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں میز کرسیاں ۔ گدھا ابھی تک دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے گدھے کو دیکھ کر کہا۔

"اندر آجاؤ ساتھی ۔ باہر کیا کر رہے ہو؟"

گدھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر آگیا اور اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"تھک گئے ہو۔" پروفیسر نے کہا۔

" تم آرام کرو۔ میں ذرا گھر کا جائزہ لیتا ہوں "۔ اور پھر وہ کھڑا ہو کر الماریوں میں رکھی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ شیشے کی الماریوں میں مختلف دوائیوں کے ڈبے پڑے تھے۔ جو سب کی سب کھیتوں اور فصلوں میں استعمال ہونے والی ادویات تھیں۔ وہ مختلف ڈبے اور بوتلیں دیکھتا رہا۔ ایک الماری میں اسے سبزیوں اور پھلوں کے بیجوں کے پیکٹ نظر آئے۔ وہ بڑی دیر کمرے کی تلاشی لیتا رہا۔ صوفے کی آگ اپنے پورے عروج پر تھی۔ سارا صوفہ جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ وہ تھک کر دوسرے صوفے پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا کہ آرام کرنا چاہیے۔ کل دن کی روشنی میں باقی گھر کی تلاشی لوں گا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور سوگیا۔

اس دن وہ بہت دیر تک سوتا رہا گدھے نے اسے کئی بار جگانے کی کوشش کی۔ کمرے میں رکھی ہوئی ایک کرسی کو دھکا دے کر گرایا۔ ایک بار اپنے منہ سے بڑی زور دار آواز نکالی مگر پروفیسر ٹس سے مس نہ ہوا۔ گدھا ڈر گیا کہ کہیں اس کا ساتھی ساتھ تو نہیں چھوڑ گیا۔

گدھا اس صوفے کے قریب گیا اور جھک کر اپنا منہ اس کے چہرے کے قریب لے گیا۔ پروفیسر نے جب گدھے کے نتھنوں کی گرم ہوا اپنے چہرے کے قریب محسوس کی تو آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر کہنے لگا۔

" آج بڑی مزیدار نیند آئی' نہ کوئی خواب ' نہ کوئی ماضی کا دردناک منظر۔ بس ہر طرف نیند ہی نیند تھی۔" پروفیسر نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

" بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ میرا خیال ہے وقت بہت گزر چکا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلتا ہوا بڑے دروازے کی طرف چلا گیا رات وہ اسی دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دروازے کے باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ باہر نکل گیا۔ سورج اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ گدھا بھی باہر آگیا اس نے دیکھا کہ خوبصورت مکانوں کا ایک دائرہ سا بنا ہوا تھا۔ گھروں کے آگے ہریالی اور پھولوں کے پودوں کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی جہاں اب بے ترتیب گھاس اور خود رو پودوں نے ایک جنگل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک طائرانہ نظر دوڑا کر پورے ماحول کا جائزہ

لیا اور پھر گدھے سے کہنے لگا۔

" یہ گاؤں بڑی PLANING کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ آؤ ذرا گھروں میں ایک نظر ڈالیں۔ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔" یہ کہہ کر وہ ایک گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ گدھا اس کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہر گھر کے سامنے پودوں اور کیاریوں کے درمیان ۵ چھ فٹ کا ایک پتھریلا راستہ بنا ہوا تھا۔ جو اندر کھلنے والے دروازے تک جاتا تھا۔ اگرچہ اب اس راستے پر بھی خود رو گھاس اگی ہوئی تھی مگر راستے کے نشان پھر بھی واضح تھے۔ وہ اس راستے پر چلتا ہوا دروازے تک آگیا کل شام دروازے سے نکلنے والے سانپ کا خوف اس کے ذہن میں اب بھی تھا۔ اس لئے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا اور دروازے کی دہلیز پر اگی گھاس کو بڑی احتیاط سے پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا۔ گدھا بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔ اس نے کمرے کے اندر کا ماحول دیکھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ غالبا" یہ کوئی دفتر تھا۔ میزوں پر کاغذات بکھرے تھے۔ الماریوں میں فائلوں کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ شیشوں پر اگرچہ گرد جمی تھی مگر بےترتیب رکھی فائلیں صاف نظر آرہی تھیں۔ جس چیز نے اسے حیران اور خوفزدہ کیا وہ میزوں کے ساتھ رکھی ہوئیں کرسیاں تھیں جن پر بیٹھے انسانی ڈھانچے ہڈیوں کی شکل میں اسے گھور رہے تھے۔ ہر کرسی پر ہڈیوں کے انسان براجمان تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے دفتری اوقات میں ان کی موت واقع ہوئی ہے۔ وہ ایک پل کے لئے لرز گیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں یہ سارے ڈھانچے اٹھ کر اسے دبوچ نہ لیں۔ کچھ ڈھانچے سامنے رکھی ہوئی میز پر جھکے ہوئے تھے اور کچھ کی ہڈیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں ۔ وہ چلتا ہوا اس کمرے سے ملحق دو دروازوں کی طرف بڑھا۔ ایک کمرے میں بوریاں پڑی تھیں جن کے منہ کھلے تھے اور مختلف اجناس کے ڈھیر ان کے سامنے مٹی کی صورت میں پڑے تھے۔ کمرے کے دروازے پر ایک چھوٹی سی تختی لگی تھی اس نے ہاتھوں سے اس پر جمی مٹی صاف کی تو (SEE DS) کے الفاظ نظر آئے۔ دوسرے کمرے میں آلات کاشت کاری رکھے ہوئے۔ جن میں لوہے

کے بلوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جو ٹرکٹروں کے پیچھے لگائے جاتے ہیں۔ وہ اس کمرے سے باہر آیا تو اس کی نظر لوہے کے بڑے بڑے ڈرموں پر پڑی جن پر (DANGER) کے الفاظ لکھے تھے جو باوجود گرد آلود ہونے کے پڑھے جاتے تھے۔ ان دونوں کمروں سے ذرا ہٹ کر ایک دروازہ تھا جو لمبائی چوڑائی میں قدرے بڑا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تھا اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھولے تو دیکھا کہ اس کے سامنے لمبا چوڑا صحن نما لان تھا جس میں دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں ان کے اردگرد چار دیواری تھی اور درمیان والی دیوار میں بڑا گیٹ تھا جس میں سے غالباً گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ وہ چلتاہوا گاڑیوں کے قریب گیا تو پتہ چلا کہ سب گاڑیوں کے ٹائر گل چکے ہیں اور وہ لوہے کے (RIMS) پر کھڑی ہیں۔ وہ گاڑیوں کا جائزہ لے کر دیوار میں بنے بڑے گیٹ کی طرف آیا تو اسے دروازے سے ذراہٹ کر ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ جس کی ساری رونق' چمک دمک ختم ہوچکی تھی جو اب صحن میں اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی شہر کے چوراہے پر کوئی ننگا فقیر کھڑا بھیک مانگ رہا ہو۔ پیٹرول پمپ کے ساتھ لگا ہینڈل (جو بجلی جانے کی صورت میں پیٹرول نکالنے کے کام آتا ہے) اب بھی لگا تھا۔ مگر اس پر مٹی جم گئی تھی اور بارش کی وجہ سے زنگ آلود ہوچکا تھا۔ اس نے اس ہینڈل کو چلانے کی کوشش کی مگر اس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ اسے چلانے کی کوشش کرتا رہا آخر اس میں کامیاب ہوگیا۔ اس ہینڈل کو اس نے تین چار بار گھمایا تو وہ آسانی سے گھومنے لگا اور پھر ربڑ کے پائپ سے پیٹرول کے کچھ قطرے باہر آئے۔ وہ مسلسل ہینڈل گھماتا رہا یہاں تک کہ اس میں سے پیٹرول کی ایک مقدار باہر آنے لگی۔ اور اس کے سامنے پیٹرول کا ایک چھوٹا سا جوہڑ بن گیا۔ اس نے ہینڈل چلانا بند کردیا اور ربڑ کے پائپ کو جو جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا لپیٹ کر پیٹرول پمپ کے اوپر رکھ دیا۔ اس نے پیٹرول کو ایک نظر دیکھا اور پھر جیب سے ماچس نکال لی۔ وہ ماچس جلانے ہی والا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا اور ماچس جیب میں رکھ لی۔ چلتا ہوا ایک جیپ کے قریب آیا اس پر عالمی بنک کا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ

اچھل کر جیپ کے بونٹ پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس دوران گدھا آہستہ آہستہ چل کر اس کے سامنے آکر زمین پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے گدھے کو دیکھ کر کہا۔

" یہ ایک ماڈل زراعتی فارم ہے ساتھی۔ یہاں سب کچھ موجود ہے۔ زمین' بیج' پیٹرول' کاشت کاری کے آلات' یہاں کچھ دن قیام کیا جاسکتا ہے۔ اگر ذرا سی محنت کی جائے تو پیٹ کی بھوک مٹانے کے بہت سے اسباب پیدا کئے جاسکتے ہیں۔"

گدھے نے اس کی بات سن کر کوئی جواب تو نہ دیا البتہ پروفیسر نے اس کی آنکھوں میں رضامندی کی ہلکی سی جھلک ضرور دیکھ لی۔ اور کہنے لگا۔

" کل سے دونوں بھائی جدوجہد کا آغاز کریں گے۔ ہل کا ایک کونہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اور ہل کا دوسرا کونہ تمہاری گردن پر۔"

اپنی جدوجہد کا آغاز کرنے سے پہلے اس نے زمین کا ٹکڑا پسند کیا جس میں ہری گھاس کا ایک جنگل اگاہوا تھا۔ آلات کاشت کاری میں اسے ایک گھاس کاٹنے والی مشین مل گئی جس سے اس نے گھاس کاٹنا شروع کردی۔ گدھے نے اپنی بساط کے مطابق اس کا ہاتھ بٹایا اور زمین کے اس ٹکڑے سے صبح و شام گھاس کھانا شروع کر دی کبھی کبھی وہ اپنے دانتوں سے گھاس جڑوں سے اکھاڑتا اور دور جاکر پھینک دیتا۔ گدھے کی خوراک کا مسئلہ تو اردگرد اگی گھاس نے حل کردیا۔ پروفیسر نے کچے پکے درختوں پر لگے پھل کھائے اور ایک دوبار جنگلی کبوتروں کا گوشت بھون کر پیٹ بھرلیا۔

زمین کا ایک لمبا چوڑا گھاس کا میدان اس نے چار دنوں میں صاف کرلیا اور پھر ایک دن میدان کے کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ اس نے کبھی کھیتی باڑی کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا تھا ۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ بس زمین میں بیج بو دیا جاتا ہے اور فصل باہر آجاتی ہے۔ اس سے زیادہ اسے کوئی علم نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اسی علم کو غنیمت جانا۔ لوہے کا ہل نکال کر میدان میں لے آیا۔ ایک رسے کے دوسرے سرے کو ہل سے باندھ کر گدھے کو ہل کے آگے جوت دیا۔ اور میدان میں ہل چلانا شروع کردیا۔ گدھا اور پروفیسر دونوں اس کام سے ناواقف تھے جو وہ کر رہے تھے ۔ لیکن کوئی انہیں کام کرتے دیکھ نہیں رہا تھا اس لئے وہ غلط سلط کام کرتے رہے۔ پروفیسر نے بیجوں (SEEDS) کے کمرے سے گلے سڑے بیج نکالے اور انہیں

اس میدان میں اچھال دیا۔ اس میدان کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھاس کاٹ کر صاف کیا اور اس میں مختلف سبزیوں اور پھلوں کے بیج بو دیئے۔ یہ سارے بیج اگرچہ دیکھنے میں صاف اور اصلی حالت میں نہیں تھے مگر اسے امید تھی کہ ان گلے سڑے بیجوں میں چند ایک ایسے ضرور ہیں جو پودا بن کر زمین سے باہر نکلنے کی سکت رکھتے ہیں۔ بیج بونے کے بعد جس چیز کی اسے سب سے زیادہ فکر تھی وہ یہ کہ اب اس میدان میں پانی کیسے پہنچایا جائے۔ پھلوں کے درختوں کے پاس ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا لیکن وہ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ نہر بہت دور تھی۔ لے دے کے ایک ہی امید تھی کہ بارش ہو ۔ گدھا اور پروفیسر دونوں دو دن بادلوں کو دیکھتے رہے مگر بارش کی ایک بوند زمین پر نہ ٹپکی۔

پروفیسر کو ایک گھر میں سے کچھ برتن مل گئے۔ کچھ دن اس نے گندم اور چاولوں کے بیج ابال کر کھائے اور گدھے کو گھاس کے ساتھ ساتھ گندم اور چاولوں کے بیج بھی کھانے کو دیئے۔ گاڑیوں کی ورکشاپ میں جاکر اس نے بڑی عقل دوڑائی کہ کسی طرح وہ کسی ایک گاڑی کو چلنے کے قابل بنالے مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔ گاڑیوں کے ٹائر بالکل ختم ہوچکے تھے اور اگر وہ ٹھیک حالت میں ہو بھی جاتیں تو ٹیوب میں ہوا بھرنے کا مرحلہ کیسے حل ہوتا۔ دو ایک روز اس نے گاڑیوں کے انجن میں سر کھپانے میں صرف کردیئے آخر اس سعی لاحاصل سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اس ماڈل فارم میں رہتے رہتے اس کا دل بھرگیا تو اس نے وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کیا اور ایک دن گدھے سے کہنے لگا۔

"ساتھی اب چلیں یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔ یہاں تو نزدیک کوئی پھلوں کا باغ بھی نہیں۔ چند درختوں پر پھل تھے وہ بھی ختم ہوگئے ہیں۔"

گدھے نے خاموش رہ کر رضامندی ظاہر کی تو وہ اپنا تھیلا اٹھا کر گھر سے نکل پڑا۔ ماڈل فارم کے کونے پر ایک چھوٹی سی عبادت گاہ تھی جس کے صحن میں اگے

گھاس پھوس کو اس نے بڑی محنت سے صاف کیا تھا۔ ماڈل فارم چھوڑنے سے پہلے وہ اس عبادت گاہ کے قریب آ کر رکا۔ اپنا تھیلا گدھے کی گردن میں لٹکایا اور خود عبادت گاہ کے اندر چلا گیا۔ اور ایک بڑی محراب کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے بڑی دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

"اے آسمانوں کے پیچھے رہنے والی طاقت۔ یہ دنیا تو نے بنائی پھر اس پر انسان پیدا کر کے رونق برپا کی۔ انسان کو عقل عطا کی۔ انسان نے اس عقل سے دنیا کو جنت بنادیا۔ لیکن کچھ انسانوں کو جنت کا یہ روپ پسند نہ آیا۔ اور انہوں نے اسے جہنم بنا دیا اور تیری بنائی ہوئی دنیا پل بھر میں اجاڑ دی اور اسے ویرانہ بنادیا۔ جس میں میں اکیلا دھکے کھا رہا ہوں۔ مجھے تو نے کیوں بچایا میں حیران ہوں؟ اس تنہائی سے وہ موت اچھی تھی جو سب کو آئی۔ اس تنہائی میں یہ گدھا پتہ نہیں کہاں سے چلا آیا۔ جو میری تنہائی کا ساتھی ہے۔ اے زندگی اور موت دینے والی طاقت۔ میری ایک دعا سن لے اور قبول کر لے۔ یا مجھے اس دنیا کے ویرانے سے اٹھا لے یا اس گدھے کو زبان عطا کر تاکہ میں اپنا دکھ اس سے کہہ سکوں اور یہ دکھ سن کر مجھے تسلی دے سکے۔"

یہ کہہ کر وہ عبادت گاہ سے باہر نکل آیا اور عبادت خانے کے دروازے پر کھڑا ہو کر عبادت خانے کی طرف منہ کر کے کہنے لگا۔

"اب میرا رخ اس طرف موڑ دے جو میری منزل کی طرف جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گدھے کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ گدھا دور ماڈل فارم سے باہر جانے والے راستے پر کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو راستے فارم سے باہر جاتے تھے۔ ایک دائیں ہاتھ تھا اور دوسرا بائیں ہاتھ۔ گدھا دائیں راستے پر کھڑا تھا۔ اس نے پل بھر سوچا اور پھر گدھے کی طرف چلا گیا اور اس کی گردن سے تھیلا نکال کر اپنے کاندھے پر لٹکایا اور کہنے لگا۔

"چل ساتھی۔ شاید یہ راستہ ہی ہمیں کسی منزل کی طرف لے جائے۔"

اور پھر دونوں سفر پر روانہ ہو گئے۔

ماڈل فارم سے نکل کر وہ دونوں سارا دن مسلسل چلتے رہے۔ رک کر کہیں آرام نہیں کیا۔ بس راستے میں پڑنے والی نہروں سے پانی پیا اور ان کے کناروں پر اگے درختوں سے توڑ کر جنگلی پھل کھائے اور پھر چل نکلے اور شام ہونے سے پہلے ایک شہر میں پہنچ گئے۔ شہر کے چوراہے پر آکر اس نے چاروں طرف اداسی اور بربادی کی میلی چادروں میں لپٹی عمارتوں اور مکانوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر ایک عمارت کی طرف اشارہ کر کے گدھے کو کہا۔

"چلو اس عمارت میں رات بسر کرتے ہیں۔ صبح آگے چلیں گے۔"

دونوں اس عمارت کی طرف بڑھے ۔ پروفیسر نے تھیلے سے ماچس کی ڈبیہ اٹھائی اور عمارت کے سامنے ایک سوکھے درخت سے کچھ ٹہنیاں توڑیں۔ جب وہ ٹہنیاں توڑ رہا تھا تو گدھا اس عمارت کے دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ گدھا اس سے پہلے اندر کیوں داخل ہوا ہے۔ گدھے کو شاید ڈر تھا کہ یہاں بھی کوئی سانپ دروازے کے پاس نہ بیٹھا ہو۔ گدھا دروازے میں کھڑا تھا۔ پروفیسر سمجھ گیا کہ اندر سب خیریت ہے۔ سردست کوئی خطرہ نہیں۔ پروفیسر نے اندر داخل ہو کر سب سے پہلے سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر ماچس جلائی اور پتلی شاخوں میں آگ لگا دی۔ لکڑیاں سوکھی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑلی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ سامنے دیوار پر بڑے بڑے الفاظ میں قومی بنک کا نام لکھا تھا۔ ہال نما کمرے میں کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ کاونٹروں پر گرد کے ڈھیر لگے ہوئے

تھے۔ اور کاونٹروں کے نیچے انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کاونٹر پر جمی گرد اور مٹی پر اس نے ہاتھ پھیرا تو مٹی کے نیچے اسے کاغذات محسوس ہوئے اس نے گرد جھاڑ کر انہیں دیکھا تو وہ نوٹ تھے۔ اس نے آنکھوں کے قریب لے جاکر دیکھا تو سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ پورے کاونٹر پر یہ نوٹ وافر تعداد میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے نوٹوں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ مسکرایا اور پھر انہیں جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا۔ آگ بجھنے کے قریب تھی اس نے چاروں طرف دیکھا تو چھوٹی چھوٹی دو میزوں پر نظر پڑی ایک میز اٹھا کر آگ پر رکھ دی اور کاونٹر سے نوٹ اٹھا کر آگ میں پھینک دیئے۔ آگ تیز ہوگئی اور پھر میز اس آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ اور سارا کمرہ روشن ہوگیا۔ اس نے آگ کی روشنی میں سونے کی جگہ تلاش کی۔ جلتی آگ سے ذرا فاصلے کے فرش کو اپنے تھیلے سے صاف کیا اور اس پر لیٹ گیا گدھا آگ کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا منہ گدھے کی طرف کیا اور کہنے لگا۔

"تمہارے دونوں پیروں کے قریب جو کاغذ پڑے ہیں یہ نوٹ ہیں۔ انسان نے ان کو جمع کرنے کے لئے کتنی محنت کی ہوگی۔ کتنے جھوٹ بولے ہونگے، کیسی کیسی بے ایمانی کی ہوگی مگر آج یہ تمہارے پیروں میں پڑے ہیں۔ میں انہیں اٹھا اٹھا کر آگ میں جلا رہا ہوں۔"

"کل کی دنیا میں ان کی اہمیت تھی۔ بہت کام نکلتے تھے ان سے۔ مگر آج ان سے صرف آگ جلائی جاسکتی ہے۔"

گدھے نے اس کی بات سن کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا واقعی نوٹ پڑے تھے جن پر گرد جمی ہوئی تھی اس نے اپنے پیروں سے دھکیل کر انہیں آگ میں پھینک دیا۔ دونوں ساری رات یہی شغل کرتے رہے۔ کاونٹر کے نیچے کھلی سیف کے اندر، کاونٹر کے پاس رکھی ٹرے میں نوٹ ہی نوٹ تھے۔ پروفیسر اٹھا اٹھا کر انہیں آگ میں ڈالتا رہا۔ آگ جلتی رہی اور دونوں آگ کی روشنی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے رہے۔ رات کے آخری حصے میں انہیں نیند آگئی۔ خالی پیٹ سوئے تھے دونوں کی

صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ بنک سے نکلے۔ شہر کا چکر لگایا۔ گھروں میں جھانک کر دیکھا۔ پروفیسر نے دو ایک کپڑے اٹھا کر تھیلے میں رکھے اور کھانے کی کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ پروفیسر چاہتا تھا کہ کچھ دیر شہر میں رہ کر ادھر ادھر کی تلاشی لے مگر پیٹ نے احتجاج کیا۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ شہر سے نکلے کہ کسی باغ میں کچھ کھانے کے لئے تلاش کریں چنانچہ دونوں شہر سے باہر نکل آئے۔

شہر کے بالکل ساتھ ایک باغ نما جھنڈ تھا جہاں کئی پھل دار درخت تھے۔ پروفیسر اور گدھا اس درختوں کے ہجوم میں چلے گئے۔ پروفیسر نے گدھے پر کھڑے ہو کر درختوں سے پھل توڑے۔ خود کھائے گدھے کے سامنے رکھے کچھ تھیلے میں بھر لیئے۔ جب دونوں کا پیٹ بھر گیا تو انہوں نے آگے کی راہ لی۔ باغ سے تھوڑی دور ایک چھوٹے سے درخت پر ایک خوبصورت رنگین پروں والی چڑیاں کو دیکھ کر پروفیسر کا دل مچل گیا۔ کافی دنوں سے اس نے گوشت نہیں کھایا تھا۔ پروفیسر نے ایک پتھر ڈھونڈ کر چڑیا کا نشانہ لینے ہی والا تھا کہ گدھا بھاگ کر اس درخت کے پاس چلا گیا اور اونچی آواز میں ڈھنچوں ڈھنچوں کرنے لگا۔ چڑیا اس کی آواز سن کر اڑ گئی۔ پروفیسر ہاتھ میں پتھ لیکر کھڑا رہا۔ اور پھر گدھے سے کہنے لگا۔

"اس کا کیا مطلب تم نے چڑیا کیوں اڑا دی"

گدھے نے ایک بار پھر بول کر احتجاج کیا۔ پروفیسر نے پتھر پھینک دیا۔ اور گدھے سے معذرت کر کے بولا۔

"آ ایم سوری ساتھی مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں پرندوں سے اتنی ہمدردی ہے۔" گدھے نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور پھر دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

دونوں چلتے رہے۔ چلتے رہے۔ دن چل کر اور رات کسی درخت تلے یا اجڑی بستی میں گزارتے۔ سردی کا موسم گزر گیا۔ گرمی آئی تو دونوں سطح مرتفع کے علاقے

میں داخل ہوگئے۔ گدھے سے اس کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ تھک جاتا تو گدھے پر بیٹھ کر سفر طے کرتا۔ گدھا گھاس پھوس کھاکر پیٹ بھرتا۔ اسے چھری اور ماچس نے پرندوں کے گوشت کا عادی بنا دیا اور پھر ایک دن جب اس نے ایک فاختہ کو مارا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی تو اس کی جان نکل گئی۔ ماچس خالی تھی۔ اب کیا ہوگا۔؟ اس نے گدھے سے پوچھا۔ گدھا چپ کھڑا رہا بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے فاختہ کا گوشت صاف کیا اور گوشت کچا ہی چبانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے "امن کے نشان" کو معدے میں اتار لیا۔ شاید معدے کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ کچھ دیر تو ٹھیک ٹھاک رہا پھر قے شروع ہوگئی۔ اور وہ نڈھال ہوکر ایک پہاڑی درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ وہ بے سدھ ہوکر کپکپانے لگا۔ بخار سے اس کا ماتھا جلنے لگا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا مگر اسے شدید سردی محسوس ہو رہی تھی۔ گدھے نے اس کو کپکپاتے دیکھا تو اٹھ کر اس طرف چلاگیا جہاں جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ اپنے منہ سے لمبی لمبی گھاس اور جھاڑیاں توڑ کر لے آیا اور اس کے جسم پر ڈال دیں۔ یہاں تک کہ اس کا پورا جسم ہری ہری گھاس اور جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ اس نے گدھے کی اس حرکت کو دیکھا تو آنکھیں کھول کر بڑی نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"THANK YOU"

گدھے نے اپنی گردن ہلائی جیسے کہہ رہا ہو۔

اسکی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

گدھے نے اپنا فرض تو خلوص دل سے نبھایا مگر اس سے ایک بھول ہوگئی۔ وہ جھاڑیاں اکھاڑ اکھاڑ کر اس پر لاکر ڈالتا رہا مگر ان زہریلی سنڈیوں پر نظر نہیں ڈالی جو کثرت سے جھاڑیوں کے پتوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ پتوں سے نکل کر اس کے پورے بدن پر رینگنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بدن پر چھوٹے

چھوٹے لال لال دھبے ابھرنے شروع ہوگئے۔ جو چھالوں کی شکل اختیار کر گئے۔ اس کا سارا جسم چھالوں سے بھر گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے لال پانی کے چھوٹے چھوٹے ہزاروں بلبلے اس کے جسم سے چپک گئے ہیں۔ وہ ساری رات جلن سے کراہتا رہا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے پورے بدن پر کسی نے آگ کے کوئلے رکھ دیئے ہیں۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ "بیمار کی رات" کیا ہوتی ہے۔ گدھا کچھ دیر تو جاگتا رہا پھر اسکی آنکھ لگ گئی اور وہ ایسی بستی کے خواب دیکھنے لگا جہاں چاروں طرف گدھے تھے۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا سرگوشی میں باتیں کر رہا ہے۔

بدن کے چھالوں میں شدید کھجلی شروع ہوئی تو اس نے اپنے لمبے نوکیلے ناخنوں سے کھجانا شروع کردیا۔ ناخنوں نے تلوار کا کام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا بدن لہو لہان ہوگیا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے' زبان لکڑی کی طرح سخت ' چہرے کے چھالے پھوٹے تو خون کی لکیریں اس کے ہونٹوں پر آکر رکیں تو اسے اپنا خون بدبو دار اور بدذائقہ محسوس ہوا مگر اس کی زبان منہ سے باہر نکل کر اپنی پیاس بجھانے لگی اور خشک ہونٹوں پر چمکتی خون کی ساری بوندیں چاٹ گئی۔ وہ درد' کمزوری اور شدت کرب سے تڑپتا رہا گدھے کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اس سے اسکی تکلیف نہ دیکھی گئی اور وہ اپنے اگلے پیر زمین پر زور زور سے مار کر اپنی بے بسی کا اظہار کرنے لگا۔

گدھے کی یہ بے تابی اور بے بسی دیکھ کر وہ بولا۔

"تو کیوں نادم ہوتا ہے ساتھی۔ تیری کوئی غلطی نہیں تونے تو اپنی طرف سے ٹھیک ہی کیا تھا۔ تجھے کیا پتہ تھا کہ جھاڑیوں میں میری موت چھپی بیٹھی ہے۔"

پھر درد سے کراہتے ہوئے بمشکل بولا۔

"بس تیرا میرا اتنا ہی ساتھ تھا۔ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں نے کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔"

گدھے کی آنکھوں میں پانی سا تیرگیا اور پھر فوراً" اٹھ کر ایک طرف چلا گیا اور

نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ گدھے کے جانے کے بعد وہ بڑی کمزور آواز میں اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری موت ایسی ہوگی۔ صرف کتابوں میں پڑھی تھی۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں اور برسوں پہلے کلاس روم کا نقشہ اس کے سامنے گھوم گیا۔ جب وہ کرسٹو فرمارلو (CHRISTOPHER - MARLOW) کے ڈرامے ڈاکٹر فاسٹ میں فاسٹ کی موت کا سین پڑھا رہا تھا۔ فاسٹ کی موت اور گوئٹے کے ڈرامے فاؤسٹ میں فاؤسٹ کی موت کا موازنہ کررہا تھا۔ تو اس کی ایک شاگردہ نے پوچھا۔

" SIR ادب میں آپ نے موت کے بہت سے منظر پڑھے ہونگے۔ آپکی نظر میں سب سے اچھا اور متاثر کن کون سا منظر ہے۔"

" ہومر (HOMER) کی کتاب اوڈی سی (ODYSS EY) میں اوڈی سی ایس (ODYSSEUS) کے کتے کی موت کا منظر جب وہ اپنے خارش زدہ جسم کو گھسیٹ کر اپنے مالک کے قدموں تک لے جاتا ہے اور مالک کے قدم چومتا ہے اور اپنی جان دیتا ہے۔ اس منظر میں کتے کا جسم بالکل گل چکا ہے۔ اس کے بدن میں کیڑے پڑچکے ہیں، آنکھوں میں زندگی کی روشنی بجھ چکی ہے۔ لیکن وہ اپنے مالک کو دیکھ کر بے تاب ہوجاتا ہے۔ موت سے مالک کے قدم چومنے کی مہلت مانگتا ہے اور مالک کے قدموں میں جاکر دم توڑ دیتا ہے۔ یہ منظر ہومر (MOMER) کے لازوال اسلوب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ منظر مجھے بے حد پسند ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔

برسوں بعد آج وہ اس کتے کی موت مر رہا تھا۔ اس کا جسم بھی گل چکا تھا۔ لہولہان تھا۔ آنکھوں میں زندگی کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔ کتے کے سامنے اس کا مالک تھا۔ مالک کی آنکھوں سے گرے آنسوؤں نے اس کی موت کا سخت مرحلہ آسان کردیا تھا۔ مگر اس کے سامنے اس کا مالک نہ تھا۔ اس کا دوست گدھا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ بھی کہیں غائب ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سیاہ دھند کا

ایک بادل چھاگیا۔ پل بھر کے لئے اس دھند میں اس کی پرانی ساری زندگی لہرا گئی۔ اس کی ماں۔ بیوی پنکی۔ اس کا اکلوتا بیٹا روکی۔ (ROCKY) اس کے پسندیدہ استادوں کے چہرے عزیز طلباء اور طالبات ۔ اور پھر وہ سب نظروں سے غائب ہوگئے۔ اس نے سوچا وہ سب نہیں رہے۔ میرا وقت بھی ختم ہوگیا۔ جس درخت کے نیچے وہ جھاڑیوں میں لپیٹا پڑا ہوا تھا اس سے تھوڑی دور ایک گہری کھائی تھی۔ اس نے اس طرف دیکھا اور فیصلہ کرلیا۔ پورا زور لگا کر اٹھنے کی کی کوشش کی۔ اٹھا مگر پھر گرگیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر چل نہیں سکے گا تو اس نے ہومر (MOMER) کی اور ڈی سی (ODYSSEY) میں مرنے والے کتے کی طرح زمین پر رینگنا شروع کردیا اور اپنے آپ کو گھسیٹ کر کھائی کی طرف لے جانا شروع کردیا۔ سو قدم کے اس سفر میں وہ جس کرب سے گزر رہا تھا اس کی زندگی کے سارے دکھ' عذاب اس کرب کے سامنے نہ ہونے کے برابر تھے۔ آہیں بھرتا۔ درد سے کراہتا وہ کھائی کے کنارے پہنچ گیا۔ اور فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے آپ کو کھائی میں گرا کر اس زندگی سے نجات پالے گا۔ پل بھر کے لئے اس نے سوچا کہ وہ اپنے ساتھی گدھے کہ خداحافظ تو کہہ لے مگر پھر سوچا کہ اسے دکھ دینے کا کیا فائدہ۔ اچھا ہے یہ سب کچھ اس کی غیر حاضری میں ہوجائے۔ وہ میرا یہ انجام نہ ہی دیکھے تو اچھا ہے۔ اس نے کھائی کے دونوں کناروں کو مضبوطی سے پکڑا اور پھر زور لگا کر اپنا سارا جسم کناروں کی طرف کھینچنے لگا۔ جتنی طاقت تھی وہ ساری اس آخری جنگ میں صرف کردی۔ جتنی دعائیں یاد تھیں دل میں دہرائیں۔ وہ آنکھیں بند کرکے خود کو جھٹکا دے کر کھائی میں گرانے ہی والا تھا کہ اس کے پیچھے سے بارعب اور گرج دار آواز میں کوئی چلایا۔

"ٹھہرو"

آواز سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور گردن اٹھا کر پیچھے دیکھا۔ اس کا ساتھی گدھا اس کے پیروں کے پاس کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"کیا کرنے جارہے تھے تم۔ خودکشی۔"

پل بھر کیلئے اس کی ساری تکلیف غائب ہوگئی۔ اس نے حیران ہو کر ساتھی سے پوچھا۔

”یہ تم بول رہے ہو“

”ہاں۔ کیوں میں نہیں بول سکتا؟۔ طوطا بول سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بول سکتا۔“ اس نے مزید حیران ہو کر گدھے کی یہ بات سنی گدھا غصے میں اس کے سر کے قریب آیا۔ اپنے دونوں اگلے پیروں سے دھکیل کر اسے کھائی سے دور کیا اور بہت غصے میں بولا۔

”یہ گھٹیا حرکت کرتے ہوئے شرم نہیں آئی تمہیں۔“ ”خود کو زمین پر خدا کا نائب کہتے ہو۔ چار دن تکلیف کے کیا کاٹے جان دینے پر تیار ہوگئے۔ غور سے سنو۔ یہ جان اس کی امانت ہے۔ جب چاہے گا آکر لے جائے گا تم اس میں خیانت کرنے والے کون ہو۔“

گدھے کی بات سن کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گدھے نے غصے میں سر ہلا کر کہا۔

”تم کچھ نہیں کہو گے۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ اس درخت کے پاس واپس چلو۔ میں درخت کے ساتھ ڈھلوان میں کھڑا ہوتا ہوں۔ تم میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ اور میری گردن کو مضبوطی سے تھام لو۔“

”اسے خاموش دیکھ کر گدھے نے کہا۔“

”کیا سوچ رہے ہو۔ جلدی کرو۔“

گدھے کی یہ بات سن کر نہ جانے اس میں کیسے اچانک طاقت آگئی۔ درخت اور کھائی کے درمیان کا فاصلہ جو اس نے چیونٹی کی رفتار سے طے کیا تھا۔ چند لمحوں میں طے کرلیا۔ گدھا ڈھلوان میں آکر کھڑا ہوگیا وہ گدھے کی پشت پر نیم دراز ہوگیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑلی۔ گدھے نے جب باہوں کو اپنی گردن میں محسوس کیا تو بھاگنا شروع کردیا۔ پتھریلے راستے پر گدھے کے پیر کئی دفعہ لڑکھڑائے مگر وہ دوڑتا رہا۔ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتا بچاتا وہ مسلسل دوڑ رہا تھا۔ بلندی سے

ڈھلوان کی طرف دوڑتے دوڑتے وہ کئی بار گرتے گرتے بچا مگر اپنے اوپر سوار دوست سے یہی کہا۔

"میری گردن مضبوطی سے پکڑلو۔ میرے پیٹ پر اپنی ٹانگوں کی گرفت مضبوط کرلو۔ فکر نہ کرو۔ میں تمہیں گرنے نہیں دوں گا۔"

وہ گدھے کو یوں فر فر باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوش تھا۔ اسکی آدھی بیماری دور ہوگئی تھی مگر اس کے بدن پر سینکڑوں چھالوں سے اب بھی خون بہہ رہا تھا ۔ اس نے سوچا پل بھر کا یہ سکون صرف اس لئے مل رہا ہے کہ وہ گدھے کو بولتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ ورنہ سنڈیوں کا زہراب بھی اس کے بدن میں رینگ رہا تھا۔ اس نے گدھے سے پوچھا۔

"تم مجھے کہاں لے جارہے ہو ساتھی۔"

گدھے نے کوئی جواب نہ دیا اور دوڑتے دوڑتے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرے اس چشمے کے پاس رک گیا۔ جس میں سے پانی ابل رہا تھا۔ پانی کی رنگت زرد تھی اور اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ چشمے سے پانی نکل کر ایک طرف چھوٹے سے حصے میں جمع ہو رہا تھا اور تالاب کی صورت اختیار کرلی تھی۔ گدھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس تالاب نما جگہ کے کنارے جاکر کھڑا ہوگیا اور زور دار جھٹکے سے اسے تالاب میں پھینک دیا۔

گدھے کی اس حرکت پر وہ سٹ پٹا گیا۔ پانی میں گرتے ہی اسکی چیخیں نکل گئیں۔ پانی کا اس کے جسم سے چھونا تھا کہ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ تالاب گہرا نہیں تھا۔ اس نے درد کی شدت سے گھبرا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو گدھے نے اپنے دونوں پیروں سے پھر پانی میں گرا دیا اور زور سے چلا کر کہا۔

"منہ ۔ آنکھیں اور ناک بند کرلو۔ اپنا سارا بدن پانی سے دھو لو۔ یہی تمہارا علاج ہے۔"

اس نے بار بار تالاب سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر گدھے نے ہربار اسے پانی

میں دھکیل دیا۔ کچھ دیر یہی کھیل جاری رہا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پانی سے باہر نکلا تو گدھا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ پانی سے باہر آتے ہی بے ہوش ہوکر زمین پر گرگیا۔ گدھا اطمنان سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا تو تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس کی نظر گدھے پر پڑی تو اس نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔

"یہ موت کا اندھیرا نہیں۔ رات ہوگئی ہے۔ سوجاؤ۔"

اس نے گدھے کو پیار سے دیکھا اور محسوس کیا کہ تالاب میں نہا کر اس کے چھالوں کی جلن بہت حد تک دور ہوگئی ہے۔ اس نے گدھے کی بات مانی۔ آنکھیں بند کرلیں اور سوگیا۔ گدھا اس کے سرہانے بیٹھا رہا بہت دیر تک جاگتا رہا اور پھر وہ بھی سوگیا۔

صبح وہ بہت دیر تک سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج اس کے عین سر پر چمک رہا تھا۔ اس نے اپنے بدن پر نظر ڈالی تو سارے چھالے خشک ہوگئے تھے۔ رات نہ اسے جلن محسوس ہوئی اور نہ ہی درد کی ٹیسیں۔ اس نے اپنے جسم پر ڈرتے ڈرتے ہاتھ پھیرا تو چھالوں کی خشک جلد جھڑنے لگی۔ اس نے تالاب کے پانی کی طرف دیکھا تو اس نے سوچا کہ پانی میں ضرور گندھک کا اثر موجود ہے اور اسی سے یہ چھالے ٹھیک ہوئے ہیں۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اسے ساتھی کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے کروٹ بدل کر اٹھنا چاہا تو آسانی سے کھڑا ہوگیا۔ وہ ٹھیک تھا بس بھوک کی وجہ سے تھوڑی سی کمزوری تھی وہ چلتا ہوا چشمے کے پانی کی طرف گیا اور پھر تالاب میں داخل ہوگیا خوب جی بھر کر نہایا۔ جب نہاتے نہاتے تھک گیا تو پانی سے باہر نکل آیا۔ گدھا سامنے سے آرہا تھا۔ اس نے مسکرا کر ساتھی کا سواگت کیا اور کہا

"تھینک یو۔ ساتھی۔"

"کس بات کا" ساتھی نے کہا۔

"میری جان بچانے کا" اس نے کہا۔

گدھے نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"میری برادری کے ساتھ تم انسانوں کا ظالمانہ سلوک سوچ کر خیال تو آیا تھا کہ تمہیں کھائی میں گرنے دوں۔ مگر تمہاری محبت نے ایسا نہیں کرنے دیا۔"

پروفیسر چپ رہا۔ گدھے نے کہا۔

"ہم نے ساری زندگی تم لوگوں کے بوجھ اٹھائے۔ کام میں ہاتھ بٹایا۔ مگر انعام میں بے وقوف ہی کا خطاب پایا۔ عام آدمی تو خیر عام آدمی ہی ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ہمارے مظلوم طبقے کی نہ سنی۔ بلکہ روز مرہ کے محاوروں میں ہمیں ہی ذلیل کیا۔"

وہ ساتھی کی باتیں سن کر ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

"میں اپنی برادری کے ظلم و ستم کی تم سے معافی مانگتا ہوں دراصل انسان کبھی کبھی اپنی اصلیت فراموش کر کے خدا بن بیٹھتا ہے۔ میں تم سے دوبارہ معافی مانگتا ہوں۔"

"اب معاف کرنے کا کیا فائدہ۔ تمہاری برادری خود اپنے ہاتھوں خود تباہ و برباد ہوگئی۔" گدھے نے تنضیھ کہا۔"

"خدا نے انسان کو نائب بنا کر بھیجا۔ عقل دی۔ تعمیری کاموں کے لئے مگر وہ اسے تخریبی دھندوں میں صرف کرنے لگا۔ انسانیت کو راحت دینے کی بجائے مہلک ہتھیار بنا کر ڈھیر لگا دیا۔ اور پھر بندروں کی طرح لڑنے لگا۔ خدا نے جو دنیا ۷ دن میں بنائی تھی اسے سات منٹوں میں فنا کردیا۔ اسکی بنائی ہوئی کیمیائی گیس ایسے فضا میں پھیلیں کہ اسکی نسل کا ایک ایک فرد چن کر کھا گئیں بس ایک تم بچے ہو۔"

"ہاں ۔ اور میں سوچتا ہوں میں کیسے بچ گیا۔" اس نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ " ایٹمی ہتھیار خودبخود بپھر کر جب اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلے اور پوری دنیا میں موت کا کھیل کھیلنے لگے تو کوئی محفوظ نہ رہا۔ ہسپتالوں، دفتروں، سکولوں اور گھروں میں کیمیائی زہریلی ہوا ہوا بن کر زندہ افراد کے اندر گھس گئی اور موت کی مہر لگا کر ہی باہر نکلی۔ مگر میں لائبریری کے تہہ خانے میں کتابوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھا رہا۔ میں سہما سہما باہر نکلا تو میرے علاوہ کوئی زندہ نہ تھا۔ میں اب سوچ رہا ہوں میں کیسے بچ گیا۔"

"شاید اس لئے کہ تم علم کی چار دیواری میں بیٹھے تھے۔" گدھے نے کہا۔

"اور تم۔ میرا مطلب ہے تم کیسے بچ گئے۔" اس نے گدھے سے پوچھا۔
"کیمیائی گیس نے جانوروں اور پرندوں پر بہت کم اثر کیا ہے۔ پرندے اور جانور گیس سے نہیں بھوک پیاس سے مرے ہیں۔ میرے بچنے کی شاید ایک وجہ اور بھی ہے۔"
"وہ کیا" پروفیسر نے گدھے سے پوچھا۔
"میرا مالک ایک دیہاتی مذہبی آدمی تھا۔" گدھے نے کہا۔ "وہ مجھ پر مذہبی کتابوں لاد کر گاؤں گاؤں پھر کر بیچتا تھا۔ میں شاید مذہبی کتابوں کا بوجھ اٹھانے کے صلے میں بچ گیا۔"
"اور وہ مذہبی آدمی جو کتابیں بیچتا تھا وہ کیوں نہیں بچا۔" اس نے پوچھا۔
"وہ منافق تھا۔" گدھے نے کہا۔ "کتابیں ادھار بیچتا تھا اور کتاب کی اصل قیمت پر سود لیتا تھا۔ اتنا عرصہ مذہبی کتابوں کا دھندا کیا مگر مجال ہے کبھی مذہب کے بارے میں ایک لفظ پڑھا ہو۔ کہتا کچھ تھا مگر کرتا کچھ تھا۔ لوگوں کو عورتوں کی عزت کرنے کا درس دیتا تھا مگر اپنی بیوی کو روز رات کو مارتا تھا۔ لوگوں کو مال و دولت سے نفرت کا سبق دیتا تھا۔ مگر خود نوٹ اپنے بستر کی دری کے نیچے بچھا کر سوتا تھا۔ بیوی کے علاوہ دو ناجائز بیویاں رکھی ہوئیں تھی اس نے۔ میں اسکی دوغلی فطرت پر بہت کڑھتا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ چپ چاپ مذہبی کتابیں ڈھوتا رہا شاید اس لئے میری جان بچ گئی۔ "گدھے نے اپنی آپ بیتی کہہ لی تو اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مگر تم کیسے بچ گئے۔"
"یہی بات میں برسوں سے سوچ رہا ہوں۔ کہ میں کیسے بچ گیا۔"
پروفیسر نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا "میری ماں حج پر گئی تھی۔ کہتی تھی کہ اس نے میرے لئے دعا مانگی تھی کہ میں قیامت تک زندہ رہوں۔ میرا خیال ہے اسکی دعا قبول ہوگئی ہے۔ ورنہ میرے بچنے کی اور کوئی وجہ نہیں۔"
گدھا اس کی بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جب گدھا کافی دیر کچھ نہ

بولا تو اس نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو ساتھی۔"

"تمہاری ماں کی دعا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" گدھے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اگر دعا واقعی قبول ہوگئی ہے تو پھر تم اکیلے قیامت تک زندہ رہ کر کیا بھاڑ جھونکو گے۔"

گدھے نے اپنے ہونٹوں کو بڑی معصومیت سے سکیڑا اور کہنے لگا۔

"دیکھو ساتھی۔ اگر تم اپنی ماں کی دعا سے زندہ رہ سکتے ہو تو ہو سکتا ہے کہیں کوئی اور بھی ماں کی دعا کے حصار میں محفوظ گھوم پھر رہا ہو۔"

"سالوں سے میں کنوئیں جھانک رہا ہوں مجھے تو کوئی ملا نہیں۔" پروفیسر بولا۔

"یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ سالوں کے قدم اسے نہیں ماپ سکتے۔ ابھی اور آوارہ گردی درکار ہے۔" گدھا بولا۔ پھر کھڑے ہوکر اس نے ادھر ادھر ٹہلنا شروع کردیا۔ پروفیسر اسکی یہ حالت دیکھ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں گم ہے۔ چند منٹ گدھے پر یہی کیفیت طاری رہی پھر وہ رک گیا اور بولا۔

"تم مرنے کے لئے قیامت کا انتظار نہ کرو۔ مرنے سے پہلے اپنا نقش چھوڑ کر مرو۔"

"کیا مطلب" پروفیسر نے گدھے کو حیرانی سے دیکھ کر پوچھا۔

گدھے نے مسکرا کر کہا۔

"تم انسان ساری زندگی میری برادری کو گدھا کہہ کر مذاق اڑاتے رہے ہو۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں گدھا کہہ کر اپنی برادری کی بے عزتی کا بدلہ لے لوں" گدھا پل بھر کے لئے رکا پھر کہنے لگا۔

"دیکھو ساتھی تم فی الحال انسانی نسل کے آخری فرد ہو قدرت شاید تمہیں زندہ رکھ کر تم سے کچھ کام لینا چاہتی ہے۔

"کیا کام" اس نے گدھے کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔
"انسانی نسل کو آگے بڑھانے کا کام" گدھا بولا۔
"مگر کیسے"
"یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کر کے قدرت کا یہ منشا پورا نہیں کرسکتے۔" گدھا بولا۔
"تمہیں اس کام کے لئے کسی عورت کو ڈھونڈ نا ہوگا۔"
"مگر عورت کیسے ملے گی۔" پروفیسر نے سر کھجا کر کہا۔
"یار میں گدھا ہو کر ہمت نہیں ہار رہا۔ تم انسان ہو کر دل چھوٹا کر رہے ہو۔ یہ مجھ پر چھوڑو۔ ہم کو نہ کونہ چھان ماریں گے۔ کیسے نہیں ملے گی عورت۔" گدھے نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کہا۔
تمہارا بدن صحت مند ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دو بار اور نہا لو یہ بدن زرخیز رہا تو اسی میں سے عورت کی کونپل پھوٹے گی۔"
پروفیسر گدھے کی بات سن کر کچھ سوچنے لگا اور پھر بڑے سنجیدہ انداز میں بولا۔
"میں اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں۔"
"کیسی تبدیلیاں"
"کچھ جسمانی اور کچھ ذہنی۔" پروفیسر نے کہا۔
"مثلاً" "گدھے نے پوچھا۔
"مثلاً" جب تم عورت کا ذکر کرتے ہو۔ نہ میں چونکتا ہوں اور نہ ہی میرے جسم کا کوئی حصہ۔" پروفیسر نے بڑی معصومیت سے شکایت کی
" یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔ سات سال سے تمہارے بدن کی رہگزر سونی پڑی ہے۔ کوئی مسافر گزرا نہیں۔ کوئی گزرے گا تو رہگزر خود اس کا استقبال کرے گی۔ اچھا مجھے ایک بات تبلاؤ۔" گدھے نے پروفیسر کے بالکل قریب آکر پوچھا۔
"جب چنگی تمہارے خیالوں کی دھند میں ابھرتی ہے پھر بھی نہیں چونکتے۔"

"پروفیسر نے چند لمحے سوچا۔ اپنی یاد داشت پر زور دیا اور بولا۔

"نہیں اسے یاد کر کے میں چونکتا نہیں اداس ہو جاتا ہوں لیکن آج کل تو عجب کیفیت ہے۔ میری دور کی یاد داشت میں خلل آنے لگا ہے۔ بہت کچھ بھولنے لگا ہوں۔"

"کسی دن راستے میں کیلوں کا باغ آگیا تو یاد داشت کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" گدھے نے فوراً جواب دیا

"کیا مطلب" پروفیسر نے پوچھا۔

گدھے نے ایک زور دار قہقہہ نما آواز لگائی اور کہا۔

" آباد دنیا کے زمانے میں جب کوئی انسان عقل کی بات سمجھنے میں دیر لگاتا تھا تو عقل مند اکثر ہنس کر کہا کرتے تھے۔ "یار تم بالکل گدھے ہو اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر" پروفیسر بولا۔

" میرا جی چاہتا ہے آج میں کہوں یار پروفیسر اتنی سی بات نہیں سمجھتے تم بالکل گدھے ہو۔"

پروفیسر نے ہنس کر کہا۔

"اس صورت حال میں میں بالکل گدھا بننے کو تیار ہوں تم انسان بن کر مجھے بات سمجھاؤ"۔ یاد داشت کا کیلوں سے کیا تعلق ہے۔"

"دو کیلے روز کھانے سے یاد داشت تیز ہوتی ہے۔ بھولی بسری باتیں ہلکے سے اشارے پر سامنے آکھڑی ہوتی ہیں" گدھے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم کھاتے رہے ہو کیلے۔"

"آباد دنیا میں کیلا میرے حصے میں کہاں آتا تھا۔ میں نے تو صرف کیلوں کے چھلکے کھائے ہیں۔"

" چھلکے کھانے پر یہ حال ہے کیلے کھا لیتے تو پتہ نہیں کیا کرتے۔" پروفیسر نے کہا۔

"میں نے جو کرنا ہے مجھے معلوم ہے۔ اب تم یہ کرو۔ کہ کپڑے اتار کر تالاب میں کود جاؤ۔" گدھے نے کہا۔

پروفیسر نے گدھے کی بات خاموشی سے سنی اور کپڑے تار کر گندھک کے تالاب میں کود گیا۔

پروفیسر دن بہ دن صحت مند ہوتا گیا۔ ایک دن وہ تالاب سے نہا کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا اس کا سارا بدن بھلا چنگا تھا۔ کسی چھالے کا نشان تک نہ تھا۔ اس نے اپنے بدن پر ہاتھ پھیرا تو اسے اچھا لگا۔ نرم' ملائم' ریشمی کپڑے کی طرح پھسلن تھی اس کی جلد پر۔ وہ اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر بڑی دور کی سوچ میں گم ہوگیا۔ ایک دن پنکی نے اسی طرح ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"تمہارا بدن بہت ملائم ہے بالکل میرے بدن کی طرح ایک بال تک نہیں تمہارے بدن پر۔"

"ہاں" اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔" سکندر اعظم کا بدن بھی ایسا ہی تھا۔ ہر قسم کے بالوں سے آزاد۔"

"اچھا" پنکی نے اس کی بات سن کر کہا۔

"ہاں۔ سکندر اعظم ارسطو کا شاگرد تھا اور ارسطو مانا ہوا طبیب' کہتے ہیں اس نے سکندر کو ایسی ادویات کھلائیں کہ ساری زندگی بالوں نے اس کی جلد کا رخ نہ کیا۔" ------! وہ اس سوچ میں گم تھا۔ اس کے ساتھی گدھے نے اسے گہری فکر میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو ساتھی۔"

پروفیسر نے ماضی کی حسین یادوں سے باہر آکر کہا۔

"کچھ نہیں پنکی کی ایک بات یاد آگئی تھی۔" پھر اس نے اپنے تھیلے سے ایک

قمیض اور پتلون نکالی جو اس نے بہت دن پہلے بستی کے ایک گھر سے اٹھا کر تھیلے میں رکھ لی تھی اور کپڑے پہن کر گدھے کے سامنے آ بیٹھا۔ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی سے پانی نچوڑ کر کہنے لگا۔

"یہاں ہمارا پڑاؤ کچھ زیادہ دن نہیں ہوگیا۔"

"ہاں" گدھے نے جواب دیا۔ "لیکن تمہاری بیماری کے لئے یہ ضروری تھا۔ اب تم بھلے چنگے ہوگئے ہو۔ سفر شروع کرتے ہیں۔"

پروفیسر نے تھیلے میں سے چیزیں نکال کر اپنے سامنے ڈھیر کرلیں ۔ اس میں ایک قینچی تھی۔ ایک خالی ماچس کی ڈبیہ ۔ ایک چھوٹا سا کنگھا۔ ایک چھری اور اپنی کتاب ۔ وہ قینچی اٹھا کر چشمے کی طرف جانے لگا تو گدھے سے کہا۔

"میں ذرا بال کاٹ لوں۔ بہت بڑھ گئے ہیں۔"

گدھا خاموش رہا۔ وہ چشمے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر قینچی کے دونوں بازوں پر رگڑنے لگا۔

قینچی کے پھلوں پر انگلی پھیر کر قینچی کی تیزی محسوس کی اور پھر چشمے کے شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر داڑھی کے بال کاٹنے لگا۔ داڑھی کے کٹے ہوئے بال پانی میں گر رہے تھے۔ بڑے دنوں کے بعد اس نے اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے اپنے چہرے سے ڈر آنے لگا اور پھر جلدی جلدی چہرے کے سارے بال کاٹ دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے چہرے کی جلد نظر آنے لگی۔ بڑی محنت سے اس نے داڑھی کا ایک ایک بال چن چن کر کاٹا اور پھر سر کے بالوں کی وہ بڑھی ہوئی لٹیں کاٹ دیں جو ہوا سے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتی تھیں ۔ یہ کام ختم کرکے وہ اٹھا اور گدھے کے پاس آگیا۔ ساری چیزیں سمیت کر تھیلے میں رکھیں اور گدھے سے کہنے لگا۔

"اس پہاڑی علاقے سے دو راستے آگے کی طرف جاتے ہیں۔ کس راستے پر سفر شروع کیا جائے۔"

"ماڈل فارم کے عبادت خانے میں تم نے دو دعائیں مانگیں تھیں۔" گدھا بولا۔

"ہاں ۔ ان میں سے ایک تو قبول ہوگئی۔" پروفیسر نے کہا

"تمہیں زبان مل گئی۔ تم باتیں کرنے لگے۔"

"دوسری دعا کے قبول ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔"

گدھا بولا ۔۔ "ہم اپنی منزل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔"

"مگر اس منزل تک ہمیں راستہ کون سا لے جائے گا۔" پروفیسر نے کہا۔

مَیں ہمیشہ دائیں طرف چلا ہُوں ۔ فارم سے نکلتے وقت بھی میں نے دائیں طرف کا راستہ انتخاب کیا تھا۔ گدھے نے کہا۔ "اب بھی ہم داہنے راستے پر گامزن ہونگے۔"

"تو چلو" پروفیسر نے تھیلا کندھے پر لٹکایا اور بولا۔

"اب دن ڈھل گیا ہے۔ تم نے بال کاٹنے میں چار گھنٹے لگادیے۔ کل صبح صبح چلیں گے تاکہ شام تک کسی جگہ پہنچ جائیں۔"

پروفیسر نے گدھے کی بات مان لی۔ وہ رات دونوں نے گندھک کے چشمے کے ساتھ درخت کے نیچے کاٹی اور درخت پر لگے کھٹے میٹھے کچے پھل کھا کر پیٹ بھرا۔

دوسرے دن سورج کی آنکھ کھلتے ہی وہ دونوں سفر پر روانہ ہوگئے۔ پہاڑی علاقے کا یہ سفر بے حد دل چسپ تھا۔ جھرنوں' چشموں'باغوں اور خوبصورت نظاروں کا یہ علاقہ دونوں کو بہت پسند آیا۔ ہر طرف کھلے ہوئے پھول۔ سرسبز درخت اور ہری بھری زمین ان کا دامن پکڑ کر کہہ رہی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو۔ یہاں ہی رک جاؤ۔"

پروفیسر کا دل کئی بار رکنے کو چاہا مگر گدھے نے ایک رات سے زیادہ کہیں ٹھہرنے نہ دیا۔ اس نے گدھے کو انگریزی شاعری کے بار بار حوالے دے کر اپنی بات منوانے کی کوشش کی مگر گدھا ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ تمہارا مقصد قیام سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ ایک بار جب گدھے نے یہ بات دھرائی تو وہ دونوں ایک چشمے کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گدھا پانی میں لیٹا ہوا تھا اور پروفیسر کے دونوں پاؤں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"یار ساتھی ۔ اگرچہ تم نے کالج یونیورسٹی کا منہ نہیں دیکھا۔ مگر تم باتیں بے حد مستند اور اعلیٰ کرتے ہو۔"

گدھے نے پانی میں لیٹے لیٹے دم ہلائی اور کہنے لگا۔

"اعلیٰ اور مستند گفتگو کرنے کے لئے تعلیم اور پڑھائی کی ضرورت نہیں۔ عقل کی ضرورت ہے۔ تم نے پڑھے لکھے کم عقل نہیں دیکھے۔"

پروفیسر نے کہا۔

"ہاں دیکھے ہیں۔"

"تو پھر تم کیسے مجھے طعنہ دے رہے ہو۔ میں یونیورسٹی اور کالج نہیں گیا مگر میں کئی بار بوجھ اٹھا کر ان دونوں کے قریب سے گزرا ہوں۔ میں نے باہر ہی سے وہ کچھ سیکھ لیا جو کچھ تمہارے بھائی اندر رہ کر نہیں سیکھ سکے۔"

"I am Sorry" پروفیسر بولا

"یہ بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان پڑھائی لکھائی نے پہنچایا ہے بلکہ انسان نے پہنچایا ہے۔ تم نے کبھی کسی گدھے کو گدھے کا خون کرتے دیکھا ہے۔۔" گدھے نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میں نے انسان کو انسان کی شہہ رگ کاٹتے دیکھا ہے۔" گدھا بولا۔

"کبھی تم نے دیکھا کہ گدھوں کی فوج دوسرے گدھوں سے لڑنے گئی ہو۔"

"نہیں" پروفیسر نے جواب دیا۔

"میں نے انسانوں کو انسانوں پر چڑھائی کرتے دیکھا ہے۔ انسانوں کو انسانوں کی قید میں مرتے دیکھا ہے۔ بچوں کو قتل اور عورتوں کو انسانوں کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھا ہے۔" گدھے نے پانی سے باہر نکل بات آگے بڑھائی۔

"اب تم بتلاؤ۔ کالج یونیورسٹی جانے والے انسان اچھے کہ اینٹیں، گارا اور بوجھ ڈھونے والے گدھے"

"گدھے، پروفیسر نے مسکرا کر جواب دیا اور دونوں پہاڑ پر چڑھنے لگے -----

پہاڑ کی چوٹی سے وہ نیچے اترے تو سورج پہاڑ کے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ دونوں نے چوٹی پر بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا اور پھر ڈھلوان کی طرف اترنے لگے۔ یہ ڈھلوان ایک دریا کے کنارے جا کر ختم ہوتی تھی۔ دونوں کو پہاڑ سے اترنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور وہ جلد ہی دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ شفاف پانی میں دونوں خوب نہائے۔ پانی پیا، کنارے پر لگے درختوں سے پہاڑی پھل کھائے۔ شام ہونے کو آئی تو گدھا کہنے

لگا۔

"میں دریا میں اتر کر دیکھتا ہوں کہ اس کی گہرائی کتنی ہے تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔ جہاں پانی گہرا ہوگا میری پیٹھ پر بیٹھ جانا۔" یہ کہہ کر گدھا دریا میں اتر گیا۔

دریا نہ گہرا تھا اور نہ ہی اس کی چوڑائی زیادہ تھی۔ عام نہروں کی طرح تھا۔ بس پہاڑی علاقوں کے دریاؤں کی طرح پانی کی رفتار بہت تیز تھی۔ دونوں دریا میں بڑے آرام سے چلتے چلتے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے بہت گہرا جنگل تھا۔ چیڑ' دیو دار کے درخت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ تیز ہوا درختوں کے پتوں سے ہوتی ہوئی ان سے ٹکرا کر گزری تو پروفیسر اس ہوا میں رچی ہوئی خوشبو سونگھ کر چونک گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔" گدھے نے کہا۔

"ایسا لگتا ہے یہ ہوا انسانوں کے دیس سے نہیں آرہی۔" پروفیسر بولا۔

"انسانوں کا دیس" گدھے نے حیران ہوکر کہا۔

"بھائی وہ تو کب کا اجڑ چکا۔ اب تم کس دیس کی بات کرتے ہو۔"

"میرا مطلب ہے مجھے اس میں ایک عجیب سی خوشبو آئی ہے۔ جو میں بتلا نہیں سکتا۔"

"تمہیں اس الجھن میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ابھی شام نہیں ہوئی۔ اس جنگل کے دوسری طرف کوئی نہ کوئی گاؤں شہر یا بستی ضرور ہوگی۔ جہاں ہم جاکر رات گزاریں گے۔" گدھے نے اپنی بات ختم کی اور پھر جنگل کی طرف جاتے ہوئے ایک راستے پر چلنے لگا۔ پروفیسر بھی اس کے ساتھ ہوگیا۔ وہ جنگل میں داخل ہوئے تو پروفیسر کو جنگل کے درختوں سے ہوا کے گزرنے کی آواز سے بہت خوف آیا۔ اس نے گدھے کی گردن پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ گدھے نے اس کے ہاتھ کی لرزش سے اس کے خوف کو محسوس کرلیا اور بولا۔

"میں پہلی بار تمہیں اس حالت میں دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں مجھے بھی پہلی بار یہ محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا" گدھا بولا۔

"کہ ہم کسی غلط جگہ جا رہے ہیں۔" پروفیسر نے فوراً جواب دیا۔

"کبھی کبھی انجانے خوف ہمیں سیدھے راستے پر جانے سے بھی روک دیتے ہیں۔ ہوتا ہے نا ایسا۔" گدھے نے پوچھا۔

"ہاں ہوتا تو ہے کبھی کبھی۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"تو بس سمجھ لو۔ کچھ ایسے ہی انجانے خوف تمہارے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ چپ چاپ چلتے رہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کوئی آفت ٹوٹی تو میں خود پر سہہ لوں گا۔"

گدھے کی یہ بات سن کر اسے بڑا حوصلہ ملا۔ وہ گدھے کو دیکھ کر بولا۔

"یار ساتھی اگر تم نہ ملتے تو کبھی کا مرگیا ہوتا۔"

"مگر میں کیوں نہ ملتا۔" گدھا بولا۔ "یہ تو تمہارے اور میرے مقدر میں لکھا تھا کہ یہ کشت مل کر کاٹنا ہے سو کاٹ رہے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے جنگل کا راستہ ختم ہوگیا۔ اب رات ہوچکی تھی آگے بالکل اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب جہاں ہیں وہیں آرام کیا جائے۔ صبح سورج نکلے گا تو دیکھیں گے کہ آگے کیا ہے۔ چنانچہ دونوں جہاں کھڑے تھے وہیں جگہ بنا کر سوگئے۔

صبح گدھے نے اس کے کان میں سرگوشی کی "ساتھی اٹھو۔ دیکھو ہم کہاں آگئے ہیں۔"

اس نے آنکھ کھولی تو دن نکل آیا تھا۔ اور گدھا اسے جگا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"کیا بات ہے۔"

"اپنے پیچھے دیکھو۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عظیم الشان قلعے کی عمارت زمین کے سینے پر پاؤں جما کر کھڑی ہوئی تھی۔ اونچی شہرپناہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اونچی دیواروں کا سرخ پتھر سورج کی روشنی میں خون کی طرح چمک رہا تھا۔ شہرپناہ کے اوپر محافظوں کے جھرونکے تھے۔ اور ان جھرونکوں پر چھوٹے چھوٹے پرچم لہرا رہے تھے۔ قلعے کا بڑا دروازہ جو مضبوط سیاہ لوہے سے بنا ہوا تھا بند تھا اور قلعے کے باہر ایک طویل القامت آدمی جس کا نصف دھڑ انسان کا تھا اور ناف سے اوپر کا حصہ بن مانس کا تھا۔ لوہے کا مضبوط لٹھ لیکر کھڑا ہوا تھا۔ پروفیسر نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا

"یہ زندہ ہے۔"

"نہیں یہ بت ہے۔ بے جان بت" پروفیسر نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ بن مانس کی زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں سرخ روشنی سی چمک رہی تھی۔

"میں اس کے گرد چکر لگا کر آیا ہوں۔ اس میں جانداروں والی کوئی بات نہیں۔ بس لٹھ لیکر کھڑا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔"

پروفیسر نے گدھے سے پوچھا۔

"ہمیں اس قلعے کے اندر جانا ہوگا"۔

"مگر کس طرح" پروفیسر نے پوچھا۔

"اس بڑے دروازے کے ذریعے جو سامنے نظر آ رہا ہے۔"

"مجھے اس بن مانس سے ڈر آرہا ہے۔ پروفیسر نے کہا۔

"اندر جاکر ہم کسی آفت میں نہ پھنس جائیں۔"

"یہ تو اندر جاکر ہوگا۔ پہلے اندر تو چلیں۔" گدھے نے کہا۔

گدھے کے بار بار کہنے پر پروفیسر ہمت کر کے اٹھا۔ اپنا تھیلا اس نے گدھے کے گلے میں ڈال دیا۔ خود اپنی پتلون کو پیٹ پر کس کر باندھا جو خوف کی وجہ سے بار بار نیچے کھسک رہی تھی اور پھر بن مانس کے بت کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔

پروفیسر جوں جوں بن مانس کے قریب جارہا تھا اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بن مانس کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے بن مانس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ بت تھا۔ بے جان بت جس کی سرخ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سرخ روشنی سی چمک رہی تھی۔ اس نے اس کو دیکھ کر اچھی طرح تسلی کی اور پھر اسکی طرف پشت کر کے دروازے کی طرف بڑھنے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بن مانس کے جسم میں حرکت ہوئی ۔ وہ اپنی جگہ سے مڑا۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا لوہے کا لٹھ ہوا میں لہرایا اور پھر پروفیسر کے سر پر آکر پڑا۔ پروفیسر اتنی شدید ضرب سے بے سدھ ہوکر زمین پر گر گیا۔ گدھے نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ ایک پل ضائع کئے بغیر واپس جنگل کی طرف بھاگ گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بن مانس نے زمین پر پڑے پروفیسر کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور بڑے گیٹ کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ گدھا پروفیسر کا تھیلا گلے میں ڈالے دور ایک درخت کی اوٹ سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

اس کے کانوں میں بڑی عجیب و غریب آوازیں پڑ رہی تھیں ایک شور ایک ہنگامہ۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے جنگل کے سارے بھوکے وحشی درندے اپنے شکار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر بہ صد کوشش وہ ایسا نہ کرسکا۔ بس اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس کے دونوں بازو کسی کی گرفت میں تھے اور اسے بری طرح گھسیٹا جا رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں بے جان حصے کی طرح زمین پر گھسٹتی جارہی تھیں۔ شور اس کے اردگرد بڑھتا جارہا تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے اب اسے سیڑھیوں پر اوپر کی طرف کھینچا جارہا ہے۔ جب اس کے گھٹنے بری طرح سیڑھیوں کی اینٹوں سے مسلسل ٹکرائے تو درد کی شدت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اسے بن مانس نما دو جانوروں نے پکڑا ہوا ہے۔ اور ان کے ساتھ ملتے جلتے بن مانسوں کا ایک دستہ اس کے اردگرد ہے اور وہ اسے گھسیٹ کر ایک اونچی عمارت کے بڑے گیٹ کی طرف لے جارہے ہیں۔ جس کے بڑے بڑے دروازے کسی ملک کی بڑی عدالت سے ملتے جلتے تھے۔ تین بڑے دروازوں کے باہر بالکل ویسے ہی محافظ لٹھ تھام کر کھڑے تھے جیسا محافظ قلعے کے باہر لٹھ لیکر کھڑا تھا۔ بن مانس دستے نے اسے دروازے کے سامنے پھینک دیا۔ دستے کا انچارج اندر چلاگیا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اپنے ماتحت ساتھیوں کو اشارہ کیا وہ اشارہ ملتے ہی اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

عمارت کے اندرونی حصے کی شکل ایک بہت بڑے ہال کی مانند تھی۔ گول ہال

کے چاروں طرف گیلریاں بنی ہوئی تھیں اور یہ بن مانسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور زبانیں منہ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ کچھ بن مانس اسے مارنے کے لئے لپکے مگر محافظ دستے نے انہیں دھکیل کر پیچھے کردیا۔ ہال کے ایک طرف بڑے دروازے کے بالکل سامنے ایک اونچا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر تین اونچی کرسیاں رکھی تھیں اور ان کے دائیں بائیں سامنے کی طرف کرسیوں کی دو قطاریں تھیں۔ ہال کے درمیان ایک اونچے پلیٹ فارم پر لوہے کا ایک پنجرہ رکھا تھا محافظ دستہ اسے بے جان لاش کی طرح گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر لے گیا اور لوہے کے پنجرے کے اندر پھینک کر دروازہ بند کردیا۔ محافظ دستے کے بن مانسوں نے اسے اتنی زور سے پنجرے میں پھینکا تھا کہ اس کا سر لوہے کی ایک موٹی سلاخ سے اتنی زور سے ٹکرایا کہ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے اور پھر اندھیرا چھا گیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہال میں بیٹھی عجیب و غریب مخلوق کا شور انتہائی عروج پر تھا۔ وہ لمبی لمبی زبانیں منہ سے نکالے خوفناک آوازیں نکال رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیوں کے نوکیلے ناخن بجلی کی طرح چمک رہے تھے جن سے وہ پنجرہ میں پڑے جانور کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

اچانک اسٹیج پر رکھی کرسیوں کے پیچھے بڑا دروازہ کھلا اور محافظوں کا ایک دستہ جو ایک رنگ کے لباس پہنے ہوئے تھا باہر نکلا اور ان کے آگے چلتا ہوا انچارج محافظ اسٹیج کے درمیان آگیا اس کے پیچھے آنے والے بن مانس کرسیوں سے ذرا ہٹ کر دو قطاریں بنا کر کھڑے ہوگئے۔ انچارج محافظ نے ہاتھ سے اشارہ کیا پورے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

"ہر خاص و عام خاموش ہوجائے۔ تعظیم کے لئے کھڑا ہوجائے۔ حکمران باپ تشریف لا رہے ہیں۔"

ہال کی گیلریوں میں بیٹھے سارے بن مانس خاموش ہوگئے اور کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ باندھ لئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی بڑے دروازے سے ریشمی سرخ شال

کاندھے پر رکھے ایک بوڑھا بن مانس باہر آیا۔ یہ بن مانس سفید رنگ کا تھا۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے بن مانس تھے۔ ان بچوں کے کاندھوں پر چھوٹی چھوٹی شالیں تھیں۔ بڑا بن مانس درمیان میں بچھی بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دستے کے انچارج محافظ نے بن مانس بچوں کو باری باری اٹھا کر بڑی کرسی کے دائیں بائیں بچھی کرسیوں پر بٹھایا۔ اور پھر ایک طرف تعظیم کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ سفید بن مانس نے ہاتھ کے اشارے سے ہال کی گیلریوں میں کھڑے بن مانسوں کو بیٹھنے کا شارہ کیا وہ بیٹھ گئے تو حکمران باپ نے پنجرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نفرت سے دیکھا اور کہا۔

"تو یہ بدبخت خود ہی ہمارے پاس آگیا۔"

اور پھر انچارج محافظ سے کہا۔

"اسے ہوش میں لایا جائے۔" حکمران باپ کی آواز ہال کی خاموشی میں ہر کسی کو سنائی دے رہی تھی۔ انچارج محافظ نے حکمران باپ کی آواز سن کر پنجرے کے پاس کھڑے محافظوں کو اشارہ کیا۔ محافظوں نے اسٹیج کے ساتھ کھڑے بن مانسوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اسٹیج کے ساتھ رکھی بالٹیاں اٹھا کر اسٹیج پر رکھ دیں۔ ان بالٹیوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پنجرے کے پاس کھڑے بن مانسوں نے بالٹیاں اٹھاکر پنجرے میں بے سدھ پڑے پروفیسر کے بدن پر انڈیل دیں۔ جلتا پانی جوں ہی پروفیسر کے بدن پر پڑا وہ تلملا کر کھڑا ہوگیا۔ اور درد سے چیخنے لگا۔ وہ درد کی شدت سے پنجرے میں ادھر ادھر بھاگنے لگا اور پھر پنجرے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ اسٹیج کی طرف تھا جہاں سفید بن مانس اپنے دو بچوں کے ساتھ بیٹھا اسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے پہلی بار پوری آنکھیں کھول کر ہال میں بیٹھی عجیب و غریب مخلوق کا جائزہ لیا جس کا زیر ناف حصہ انسانوں اور اوپر کا حصہ بن مانسوں جیسا تھا۔ زبان باہر لٹک رہی تھی اور اور آنکھوں میں سرخی آگ کی طرح دھک رہی تھی۔ چاروں طرف ایک سے چہرے سجے تھے۔ صرف سامنے بیٹھے تین بن مانسوں کا رنگ سفید تھا باقی سب سیاہ رنگت والے بن مانس تھے۔ سفید بن مانس پر جب اس کی

نظریں جاکر ٹھہریں تو وہ اسکی آنکھوں کی سرخی سے ڈر گیا۔ سفید بن مانس کی زبان ایک لمحے کے لئے تیزی کے ساتھ اندر گئی۔ اور وہ بولا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو۔ نائب خداوند ہماری سلطنت میں آکر۔"

بن مانس کو بات کرتے دیکھ کر پروفیسر چونک گیا۔ اپنے بدن کی ساری تکلیفیں اور گرم پانی کی جلن بھول کر وہ حیرانی سے اسے گھورنے لگا۔ سفید بن مانس نے اس کی حیرانی دیکھ کر کہا۔

"کیوں ؟ مجھے باتیں کرتے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سفید بن مانس نے ایک نفرت بھرا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"تمہیں حیوان ناطق ہونے پر بڑا فخر تھا۔ مگر آج یہ فخر بھی مٹی میں مل گیا۔ آج تم پنجرے میں بند صرف حیوان ہو اور ہم حیوان ناطق ہیں۔"

سفید بن مانس کے دائیں طرف بیٹھا بن مانس بچہ اپنا چھوٹا سا ہاتھ پنجرے کی طرف کرکے کہنے لگا۔

"بابا یہ پنجرے میں کون سا جانور ہے۔"

بوڑھے بن مانس نے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"یہ انسان ہے۔"

"انسان کیا ہوتا ہے بابا۔" بن مانس بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

"وہ ٹوکری مٹی سے بنا ہوا ایک کھلونا۔ جسے فطرت نے بڑی محبت سے روح پھونک کر زمین پر کھیلنے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اس بدبخت نے اپنی اوقات سے بڑھ کر کھیل کھیلے۔ ہریالی کو روند دیا۔ صاف پانی میں زہر گھول دیا۔ ہوا میں بارود ملادی۔ زندگی کے پیچھے موت لگادی۔ گھر قبرستان بنا دیے۔ امن کو ظلم کی بھٹی میں ڈال دیا۔ اور خدا بن بیٹھا۔"

حکمران باپ نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر ساری باتیں پروفیسر کو سنادیں۔

''پھر کیا ہوا۔'' بچے نے دوبارہ معصومیت سے پوچھا۔

''پھر'' حکمران باپ بولا ۔'' پھر خدا غضب میں آگیا ۔ روح واپس لے لی اور مٹی کو ہوا میں اڑا دیا۔ سارے کھلونے مٹی ہوگئے مگر یہ بدبخت پتہ نہیں کیسے بچ گیا ہے۔'' پھر انچارج بن مانس کی طرف منہ کر کے بارعب آواز میں بولا۔

''اس کے جرائم کی تفصیل پیش کی جائے۔''

انچارج بن مانس نے سر جھکایا۔ اور قطار میں کھڑے بن مانسوں کو اشارہ کیا ۔ وہ دروازے کے اندر چلے گئے اور ایک بہت بڑا صندوق اٹھا لائے اور انچارج محافظ کے سامنے رکھ دیا۔ انچارج محافظ نے صندوق کھولا۔ جس میں کاغذ کا ایک رول رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کا ایک سرا اٹھایا اور پڑھنا شروع کردیا۔

''میں حکمران باپ کی اجازت سے انسان کی کرتوتوں کا مختصر جائزہ پیش کر رہا ہوں۔ آسمانی خدا کے بنائے ہوئے اس انسان کے جرائم کی تفصیل بہت طویل ہے۔ صدیوں کے جرائم کی تفصیل بیان کرنے کے لئے صدیاں درکار ہیں لیکن میں کچھ مکروہ' قابل شرم اور قابل سزا جرائم کا ذکر کروں گا جو اس ظالم' فاسق' بے رحم' سنگدل اور انا پرست ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی ہونگے۔''

انچارج بن مانس نے صندوق میں رکھے کاغذ کے رول سے کاغذ کھینچا اور دوبارہ پڑھنا شروع کردیا۔

''پنجرے میں بند یہ جانور جسے انسان کہتے ہیں۔ جانوروں اور وحشیوں سے اس لئے مختلف ہے کہ وہ دو ہاتھ اور ایک باتیں کرنے والی زبان رکھتا ہے۔ یہ زمین پر کب آیا۔ صدیوں وقت کی گزر گاہ پر کیسے سفر کیا یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر ازل سے لیکر اب تک کے اس آخری انسان کے بارے میں ایک بات جو مختصر ہے وہ بالکل مستند ہے کہ یہ نہایت خود غرض' ظالم اور مطلب پرست ہے۔ اس نے ہر عہد میں اپنی حفاظت کے لئے لوگوں کا خون کیا۔ اپنے مطلب کے لئے لوگوں کے حقوق چھینے۔ تاریخ ایسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے۔''

حکمران باپ اس تفصیل سے اکتا کر بولا۔

"یہ کیا رام کہانی سنا رہے ہو۔ اختصار سے بتاؤ۔"

انچارج محافظ حکمران باپ کی اس بات سے لرز گیا۔ اور کاغذ کا رول جلدی جلدی کھولنا شروع کردیا۔ اسٹیج پر کاغذ کے تھان کا ڈھیر لگ گیا۔ رول کے آخری صفحے کو آنکھوں کے سامنے لاکر انچارج محافظ نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

"اس نے فطرت کی ہر خوبصورتی کو بیچ کھایا۔ جنگل میں اچھلتے کودتے معصوم جانوروں کے گوشت سے پیٹ کا دوزخ بھرا۔ ان کی کھالوں سے جوتیاں بنائیں۔ بیل جب تک جسمانی طور پر صحت مند رہے کھیتوں میں ان سے ہل جوتتا رہا۔ جب ان بیلوں کے قدم ڈگمگائے تو ان کو مار کر ان کا گوشت کھا گیا۔ جانوروں کو پنجروں میں بند کر کے ان کا کاروبار کرتا رہا۔ انسانوں کو غلام بناکر ان کی منڈی لگائی ہتھیار بنا کر فطرت کے خوبصورت میدانوں کو میدان کار زار بنا دیا۔ دریاؤں اور سمندروں کے رخ موڑ دیئے۔ ہتھیار بناکر ہتھیاروں کو قلم پر اہمیت دے دی۔ زہریلے اور مہلک بم بنائے۔ اپنی ہی برادری کو مار کر ان کی کھوپڑیوں پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرایا۔ درختوں کو کاٹ کر تیر' کمان اور بھالے بنائے ----- اور زمین پر خدا بن بیٹھا۔ اور آسمان کی طرف حملہ آور ہوا۔ زمین پر فساد برپا کرکے آسمانوں میں خلل ڈالنے کے لئے عزم سفر باندھا اور اس قدرت کو آنکھیں دکھائیں جس نے اس دو ٹوکری مٹی میں زندگی کی روح پھونکی تھی ----"

پروفیسر پنجرے میں کھڑا انچارج بن مانس کی تقریر بہت غور سے سن رہا تھا اور حیران تھا کہ اس نے کس محنت سے انسان کے خلاف چارج شیٹ تیار کی ہے۔ اس تقریر کے دوران اس نے کئی بار سوچا کہ بول کر اپنی صفائی پیش کرے مگر وہ ہال کے ماحول سے خوف زدہ ہوگیا۔ اسے ساتھی گدھے کی تجویز پر عمل کرکے بہت پچھتاوا تھا۔ کاش وہ اس کا کہا نہ مانتا اور قلعے کے باہر کھڑے لٹھ باز کے قریب نہ جاتا۔ نہ وہ اس پر وار کرتا اور نہ وہ اس عدالت میں پیش ہوتا مگر اب سوچنا بالکل فضول تھا۔ اسے

یقین تھا کہ اب یہ بن مانس اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور بچ نکلنے کی ساری امیدیں ختم ہوچکی تھیں۔

انچارج محافظ نے کاغذ سے آخری جملہ پڑھا۔

"اس کے جرائم کی صرف ایک سزا ہے۔ موت۔"

موت کا لفظ سن کر ہال میں موجود سارے بن مانس اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر ناچنے لگے۔ انچارج محافظ کے ہاتھ کا اشارہ دیکھ کر پھر بیٹھ گئے۔ انچارج محافظ نے کہا۔

" موت کی سزا اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ یہ انسانوں کی نسل کا آخری انسان ہے۔ یہ زندہ رہا تو اس نسل کے آگے بڑھنے کا خطرہ ہے۔ یہ نسل پھر پھلی پھولی تو خدا کی زمین پر پھر فساد اور قیامت برپا کرے گی۔"

انچارج اپنی بات ختم کر کے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ حکمران باپ نے پنجرے میں بند پروفیسر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"مرنے سے پہلے تم کچھ کہنا چاہو گے۔"

پروفیسر نے چند لمحے سوچا کہ ان کے ساتھ بحث و تکرار کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت یقینی ہے۔ صرف ایک آخری پتا ہے اور وہ ہے "معافی نامہ" ----- اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بہت ہی عاجزانہ انداز میں بولا۔

"میں ان تمام الزامات کو درست مانتا ہوں مگر میری صرف ایک گذارش ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے کوئی جرم میں نے نہیں کیا ----- میں تو ایک محقق اور پڑھانے والا آدمی ہوں۔"

"تمہاری تحقیق نے کیا دیا۔" حکمران باپ بولا "توپ بندوق' کلاشنکوف' ایٹم بم۔"

ان میں سے میں کسی کا موجد نہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

"تحقیق نے زہریلی گیس بنائی۔" حکمران باپ نے کہا۔

"یہ میرا فارمولا نہیں"

"مہلک ہتھیار بنائے" حکمران باپ جھنجلا کر بولا۔

"میں نے نہیں بنائے"

"بنانے والے انسان تھے۔ تمہاری برادری کے افراد ان کے سارے گناہوں کی سزا تمہیں ملنی چاہیئے۔"

حکمران باپ نے اپنی کرسی کے دستے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "کیونکہ وہ مر کھپ گئے ہیں۔ تم زندہ ہو۔ تمہیں اب زندہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔ تم بچ گئے تو اپنے بھائیوں کی کرتوتیں پھر دھراؤ گے۔"

پروفیسر نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

"میں معافی مانگتا ہوں۔"

"تمہارے ظلم کی چھری تلے بہت سے بے زبان تم سے خاموشی کی زبان میں مانگتے رہے ہیں۔ مگر تم نے کبھی ان کی التجا نہیں مانی۔ ہم تم پر یہ کرم کیسے کریں۔ تم ہماری سلطنت کی حدود سے باہر تھے اس لئے زندہ بچ گئے۔ اب خود ہماری حدود میں آگئے ہو۔ اس لئے سلطنت "بن مانسیہ" کا قانون تمہیں تمہارے جرائم کی پاداش میں پھانسی کی سزا دیتا ہے۔"

پھر وہ انچارج دستے کے محافظ سے کہتا ہے۔

"اسے وہیں پھینک دو جہاں پہلا قیدی پڑا ہے۔ کل رات دونوں کو شہر کے چوراہے پر پھانسی لگادو۔"

پروفیسر حکمران باپ کی بات سن کر اچانک بولا۔

"مجھے صفائی کا موقعہ دیا جائے حکمران باپ۔"

"تمہارے دامن پر خون ناحق کے اتنے دھبے ہیں کہ تم صدیوں صفائی دیتے رہو تو یہ صاف نہیں ہونگے لیکن اگر تمہیں امید ہے کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ کر بچ جاؤ گے۔ تو ہم اپنے فیصلے کے خلاف تمہیں سلطنت بن مانسیہ کی سب سے بڑی مذہبی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔"

پھر محافظ بن مانس کی طرف رخ پھیر کر کہنے لگا۔

"اسے عدالت عظمیٰ میں پیش کیا جائے۔ عدالت نے اگر اس کی سزا معاف کردی تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر حکمران باپ اٹھا۔ اس کے دونوں بچوں نے بھی کرسیوں سے چھلانگ لگا دی اور پھر حکمران باپ اپنے بچوں کو لیکر اسی دروازے سے اندر چلا گیا جس دروازے سے باہر آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اسٹیج پر کھڑے بن مانس نے پنجرے کی طرف منہ کرکے بارعب آواز میں کہا۔

"حکمران باپ کے حکم کی تعمیل ہو اور اس کو راہب بابا کی عدالت میں پیش کیا جائے۔"

بن مانسوں کا محافظ دستہ پروفیسر کو پنجرے سے نکال کر حکمران باپ کی عدالت سے باہر لے آیا۔ عدالت کے دروازے پر ایک ریڑھی کھڑی تھی جس پر لوہے کا ایک پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ محافظ دستے کے بن مانس جب پروفیسر کو بے جان لاش کی طرح گھسیٹتے ہوئے پنجرے کے قریب لائے تو ریڑھی کے پاس کھڑے ہوئے بن مانس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ محافظ دستے نے پروفیسر کو پنجرے کے اندر پھینک دیا۔ پروفیسر کا سر لوہے کے پنجرے سے بری طرح ٹکرایا اور درد کی ایک ایسی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی جو اس کی برداشت سے باہر تھی۔ جوں ہی پنجرے کا دروازہ بند ہوا ریڑھی کے پاس کھڑے بن مانسوں نے ریڑھی کو آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کر دیا پروفیسر پہلے تو درد کی شدت کی وجہ سے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا مگر جب مانسوں کی بے ہنگم اور خوفناک چیخیں اس کے کانوں میں پڑیں تو اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف آہستہ آہستہ گردن گھما کر دیکھا۔

اس کی ریڑھی ایک بازار سے گزر رہی تھی جہاں چاروں طرف بن مانس ہی بن مانس تھے۔ جن کی زبانیں لٹکی ہوئی تھیں اور آنکھیں آگ کی طرح جل رہی تھیں۔ وہ چاروں طرف سے پروفیسر کی ریڑھی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر محافظ دستہ انہیں دھکیل کر پرے ہٹا رہا تھا۔ دو ایک بار مشتعل بن مانسوں کے ہجوم نے پنجرے کی سلاخوں میں اپنے پنجوں سے اسے زخمی کرنا چاہا مگر محافظ دستے کے بن مانسوں نے ان کا حملہ ناکام بنا دیا۔ محافظ دستے کے انچارج نے جب ایک ایسے ہی مشتعل بن مانس کو روکا تو اس نے اپنی لٹکی ہوئی زبان اندر لے جا کر کہا۔

"تم کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ جانتے نہیں کہ اس نے کبھی ہماری اور ہمارے بچوں کی تجارت کی ہے۔ ہمیں پنجروں میں بند کر کے ہماری آزادی چھینی ہے۔ آج یہ ہمارے ہاتھ آیا ہے تو تم ہمارے اور دشمن کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے ہو۔"

محافظ دستہ کے انچارج نے اس مشتعل نوجوان بن مانس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جو تم کہہ رہے ہو۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ ان تمام زیادتیوں کی جو اس نے ہماری نسل کے ساتھ کی ہیں۔ سزا اسے مل گئی ہے۔ دیکھو آج یہ انسان جس نے ہزاروں سال اس زمین پر حکمرانی کی ہے۔ ہر زندہ چیز کو اپنے حکم کا پابند بنایا ہے۔ سر جھکا کر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ انسان کبھی اس دھرتی پر سر اٹھا کر چلتا تھا۔ آج بے بس' مجبور اور قابل رحم ہے۔ بن مانسیہ حکومت کے سربراہ حکمران باپ نے اس آخری آدمی کے لئے موت کی سزا تجویز کی ہے۔"

"یہ صرف حکمران باپ کی تجویز نہیں ۔ ہم سب کے دلوں کی آواز ہے۔ ہم اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔" بن مانس نے اونچی آواز میں کہا

"مگر اس نے حکمران باپ سے اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ یہ عدالت عالیہ میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہے۔ ہم اسے راہب بن مانس کے حضور پیش کر رہے ہیں" ۔ محافظ نے نوجوان بن مانس کی بات سن کر کہا۔

"راہب بابا کی عدالت میں پیش کرنے سے پہلے اسے نمائش گاہ میں لے جایا جائے۔" ہجوم میں سے ایک بن مانس نے کہا۔

"کیوں" **محافظ** انچارج نے کہا۔

"ہمارے بچوں نے کبھی انسان نہیں دیکھا۔ ہم اپنی نئی نسل کو انسان دکھانا چاہتے ہیں۔"

"مگر حکمران باپ کا حکم نہیں ہے کہ اسے نمائش گاہ میں لے جایا جائے۔"

انچارج نے کہا۔

"ہم اجازت نامہ لے آئے ہیں۔ یہ اجازت نامہ ہمارے محلے کے سردار کے پاس ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے بن مانس کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کے پاس ہے اجازت نامہ"

ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے بن مانس نے ایک چمڑے کا ٹکڑا انچارج کی طرف بڑھا دیا۔ انچارج نے چمڑے کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ٹکڑے پر لکھی تحریر کو پڑھ کر ریڑھی کھینچنے والے بن مانسوں سے کہا۔

"ریڑھی نمائش گاہ کی طرف لے چلو۔"

پروفیسر کو یہ ساری گفتگو سن کر اپنے شہر کی وہ نمائش گاہ یاد آگئی جس میں اس نے بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ جاکر پنجرے میں بند ایک بن مانس کو دیکھا تھا۔ اسوقت وہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ نمائش گاہ میں ایرانی سرکس لگی تھی۔ جس میں ایک بن مانس بھی تھا۔ لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے جاتے تھے بن مانس کو کیلے کھانے کا بہت شوق تھا۔ جو اسے دیکھنے جاتا اس کے پنجرے میں کیلے پھینک دیتا اور بن مانس اٹھا کر کھا لیتا اس نے اپنے باپ سے ضد کی کہ وہ بن مانس کو ضرور دیکھنے جائے گا۔ اس کا باپ اسے سرکس دکھانے لے گیا۔ اس دن اس نے پہلی بار بن مانس کو دیکھا تھا۔ آج بن مانس اسے دیکھنے نمائش گاہ میں آ رہے تھے۔ اور وہ پنجرے میں بیٹھا ان کی خوفناک اور مکروہ شکلیں دیکھ رہا تھا۔

نمائش گاہ میں اس کا پنجرہ ریڑھی سمیت ایک اونچی جگہ پر رکھا گیا تھا۔ بن مانسوں کی ایک لمبی قطار آہستہ آہستہ اسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ محافظ دستے اسے حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے پنجرے کے چاروں طرف لوہے سے بنی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ بن مانس قطار میں پنجرے کے قریب آتے چند لمحے ٹھہرتے، اسے دیکھتے اور پھر آگے بڑھ جاتے دیکھنے والے بن مانسوں کے چہروں پر ایک

نفرت تھی۔ کچھ نے تو اسے دیکھ کر اس پر تھوک بھی دیا لیکن بچوں کے چہروں پر ڈر اور خوف تھا۔ ایک بن مانس نے بچے کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا جب وہ پنجرے کے قریب آیا تو بچہ پروفیسر کا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ بن مانس نے بچے کو تسلی دے کر کہا۔

ڈرو نہیں۔ اب یہ کچھ نہیں کر سکتا۔" بچے کو بن مانس نے تسلی دی تو بچہ بولا۔

"مگر بابا۔ یہ دبلا پتلا انسان تو بہت کمزور نظر آتا ہے۔ اس نے بڑے بڑے وحشی درندوں کو اپنے قابو میں کیسے کر لیا تھا۔"

"یہ دبلا پتلا ضرور ہے مگر اس کے پاس ایک بہت بڑا ہتھیار ہے جو درندوں اور وحشی جانوروں کے پاس نہیں۔ بس اس ہتھیار سے وہ وحشی درندوں کو قابو کر لیتا تھا"

"وہ کون سا ہتھیار ہے" بچے نے پوچھا۔

"عقل" بن مانس نے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ ہتھیار۔ مجھے تو نظر نہیں آتا" بچے نے پنجرے میں غور سے دیکھ کر کہا۔

"یہ ہتھیار اب قدرت نے اس سے چھین لیا ہے۔ اس ہتھیار سے اس نے اپنے ہی گھر کو تباہ کر لیا ہے۔ دنیا کی بربادی کا سبب اس کی حد سے بڑھی ہوئی عقل مندی ہی تو ہے۔"

پنجرے کے پاس کھڑے ہوئے انچارج نے باتیں کرتے ہوئے بن مانس کو آگے بڑھنے کے لئے کہا اور وہ بچے کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

پروفیسر کو بن مانسوں کی لمبی قطار دیکھ کر چین کے ہیرو ماؤزے تنگ کا جنازہ یاد آگیا جو کسی عوامی مرکز میں تین دن آخری دیدار کے لئے رکھا گیا تھا اور چینی عوام اسی طرح قطاروں میں آ رہے تھے جس طرح بن مانس اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماؤزے تنگ کو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پروفیسر کو

دیکھنے والوں کی آنکھ میں نفرت اور ہونٹوں پر گالیاں تھیں۔

شام تک نمائش گاہ میں اسے دیکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ جب دیکھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تو اس کا پنجرہ ریڑھی پر رکھ کر محافظ دستہ عدالت عظمیٰ کی طرف لے گیا۔

راہب بن مانس کی عدالت ایک چوکور کمرے کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ کمرے میں ایک اونچے چبوترے پر ایک بڑا میز رکھا ہوا تھا۔ میز کے پیچھے ایک بڑی کرسی تھی جو خالی تھی۔ چبوترے کے آگے دائیں اور بائیں دو پنجرے رکھے تھے جس میں غالباً مجرم کھڑے کئے جاتے تھے۔ باقی کمرہ خالی تھا۔

محافظ دستے کے بن مانس اسے گھسیٹ کر اندر لے گئے اور دائیں طرف رکھے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر پھینک دیا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔ جب بن مانس اسے لیکر کمرے میں داخل ہوئے تھے تو زوردار خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ یہ خراٹے اتنا بلند اور بے ہنگم شور پیدا کر رہے تھے کہ لوہے کے پنجروں کے دروازے بھی لرز رہے تھے مگر جب بن مانسوں نے پروفیسر کو پنجرے میں پھینک کر دروازہ زور سے بند کیا تو خراٹوں کی آواز یک دم رک گئی اور ایک خوابیدہ سی آواز کمرہ عدالت میں گونجی۔

"کون ہے"

انچارج بن مانس نے مودب انداز میں سر جھکا کر کہا۔

"ایک قیدی لائے ہیں راہب بابا۔"

"کون سا قیدی۔" آواز نے پوچھا۔

"جسے حکمران باپ نے موت کی سزا سنائی ہے۔"

"تو کیا اس قیدی کو حکمران باپ کا فیصلہ سنائی نہیں دیا۔" آواز نے کہا۔

"یہ آپ کی عدالت میں سزا کے خلاف صفائی پیش کرنا چاہتا ہے۔" انچارج

بن مانس نے کہا۔

پروفیسر نے چاروں طرف دیکھا مگر اسے راہب بابا نظر نہیں آیا۔ کرسی خالی نظر آرہی تھی۔ ادھر ادھر کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کوئی بیٹھا ہو اور بول رہا ہو۔

"بے وقوف ہے یہ قیدی۔ جانتا نہیں کہ حکمران باپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور بدلا نہیں جاسکتا۔"

"مگر آپ تو بدل سکتے ہیں راہب بابا۔"

"ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم بدل سکتے ہیں۔ ہمیں اٹھا کر کرسی پر رکھو۔"

پروفیسر نے چاروں طرف دیکھا مگر اسے بولنے والا نظر نہیں آیا۔ انچارج بن مانس تیزی سے میز کی طرف گیا اور کرسی کے پیچھے سے ایک چھوٹے قد کے بن مانس کو اٹھا کر کرسی پر رکھ دیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ چھوٹے قد کا یہ بن مانس صرف قد میں چھوٹا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر بڑی عمر کے نشانات ہویدا تھے۔ بن مانس نے اپنی آنکھیں مل کر پوری طرح کھولیں اور پھر تن کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر کو غور سے دیکھ کر بولا۔

"اچھا تو یہ آ ہی گیا ہمارے ہاتھ۔" اور پھر انچارج بن مانس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب تم دیکھنا کہ میں ایسا فیصلہ سناؤں گا کہ تاریخ اس فیصلے پر فخر کرتی رہے گی۔"

"تاریخ کو پہلے ہی آپ کی قانون دانی پر فخر ہے۔" انچارج بن مانس نے سر جھکا کر کہا۔

راہب بن مانس نے اپنا رخ پنجرے میں بند پروفیسر کی طرف کیا اور کہا۔

"قانون بن مانسیہ ہر زندہ چیز کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا حق دیتا ہے۔ تمہیں بھی اگر حکمران باپ کے فیصلے پر اعتراض ہے تو بولو ہم سنیں گے۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

پروفیسر نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری اور بہت ہی مودب انداز میں بولا۔

"میں ان تمام الزامات کو تسلیم کرتا ہوں جو مجھ پر لگائے گئے ہیں۔"

راہب بن مانس نے پروفیسر کی بات کاٹی اور کہا

"تو پھر مرنے سے انکار کیوں کرتے ہو۔"

"اس لئے کہ یہ تمام جرائم جو میرے حساب میں لکھ دئے گئے ہیں۔ میں نے نہیں کئے۔"

"کس نے کئے ہیں" راہب بن مانس نے کہا۔

"مجھ سے پہلے کے انسانوں نے"

"کون تھے وہ"

"انسان" ۔ پروفیسر نے کہا۔

"یعنی تمہارے آباؤ اجداد" راہب بن مانس نے کہا

"جی"

تمہارا مطلب یہ ہے کہ سزا اسے ملنی چاہیے جس نے جرم کیا ہو۔" راہب بن مانس بولا۔

"جی۔ یہی مطلب ہے میرا۔"

راہب بن مانس پروفیسر کی بات سن کر کرسی پر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔

"تم نے کبھی سانپ دیکھا ہے۔"

"جی دیکھا ہے۔" پروفیسر نے راہب بن مانس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سانپ اور تمہارے پیر کی ایڑی کا ازلی بیر ہے جہاں دیکھتے ہو اسے ایڑی تلے مسل دیتے ہو۔"

پروفیسر چپ رہا۔ بن مانس پھر بولا۔

"اس لئے کہ اس کے آباو اجداد میں سے کسی نے تمہارے آباو اجداد میں سے کسی فرد کو ڈسا تھا"

پروفیسر چپ رہا اور سمجھ گیا کہ یہ چھوٹے قد کا بن مانس بہت خطرناک ہے۔ وہ منطقی انداز میں اسے مجرم ثابت کرنا چاہتا ہے۔ بن مانس پروفیسر کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"کبھی کبھی آباواجداد کے گناہوں کی سزا اس کے پوتوں اور بیٹوں کی بھگتنا پڑتی ہے۔ اس لئے حکمران باپ نے تمہارے آباواجداد کے گناہوں کا پھندا تمہارے گلے میں ڈالا ہے۔"

پروفیسر چپ رہا۔ بن مانس کرسی سے پھدک کر نیچے اتر گیا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔ پروفیسر کی نظریں اسے چاروں طرف ڈھونڈتی رہیں مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر اس کے کانوں میں راہب بابا کی آواز آئی۔

"کون ہو تم"

پروفیسر نے محسوس کیا کہ آواز بالکل قریب سے آئی ہے۔

"میں نے پوچھا ہے کون ہو تم" آواز دوبارہ آئی۔

پروفیسر نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ پھر جب جھک کر دیکھا تو راہب بن مانس اس کے پنجرے کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ پروفیسر نے اسے جھک کر دیکھا تو بن مانس پھر بولا۔

"میں نے پوچھا ہے کون ہو تم۔"

راہب بن مانس نے گردن اٹھا کر پروفیسر کی طرف دیکھا تو پیچھے کی طرف گر گیا۔ انچارج بن مانس نے بھاگ کر اسے اٹھایا۔ راہب بن مانس دوبارہ کھڑا ہوا تو غصے میں پروفیسر کو کہنے لگا۔

"بیٹھ کر بات کرو۔"

پروفیسر فورا" پنجرے میں بیٹھ گیا۔ اب دونوں آمنے سامنے تھے۔ بن مانس راہب نے بیٹھے پروفیسر کو اپنے قد کے برابر پایا تو غصے میں آگیا اور کہنے لگا۔

"کیا پڑھاتے تھے تم کالج میں"

انسان کی کہانی' اس کے ارتقا کی باتیں " اسکی معاشرتی اور فکری سرگرمیوں کی داستان"

اس کا مطلب ہے تمہاری تحقیق نے انسانوں کو دنیا برباد کرنے پر اکسایا ہے۔"

پروفیسر نے کہا۔

"نہیں ایسا بالکل نہیں۔ میں نے تو بہت اچھی اچھی باتیں کی ہیں۔ آپ بے شک میری کتاب دیکھ لیں۔"

"اچھا۔ تو تم نے کتاب بھی لکھی ہے۔ کہاں ہے کتاب۔۔" بن مانس نے کہا۔

"اس کے پاس" پروفیسر کے منہ سے اچانک نکلا

"کون اس ۔ اس کا مطلب ہے تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔" راہب بن مانس نے غصے سے کہا اور پھر انچارج بن مانس سے کہا۔

"مجھے کاندھوں پر بٹھاؤ۔"

انچارج بن مانس نے راہب بن مانس کو اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔ پروفیسر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پروفیسر نے سوچا اسے گدھے کے بارے میں بتلانا گدھے کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ کہیں یہ اسے بھی یہاں نہ پکڑ لائیں۔ چنانچہ اس نے راہب بن مانس سے کہا۔

"میرے ساتھ کوئی دوسرا نہیں۔"

"تو پھر یہ اس کون ہے۔" راہب بن مانس نے کہا۔

"وہ درخت جس کے پاس میں نے رات گزاری تھی۔ کتاب اس درخت کے پاس پڑی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ بات بدل رہے ہو۔ مگر ہم فیصلہ نہیں بدلیں گے۔ تم زندہ رہے تو اور کتابیں لکھ لکھ کر گمراہ کروگے لیکن ہم تمہیں یہ موقعہ نہیں دیں

گے۔ حکمران باپ کا فیصلہ قائم رہے گا۔ تمہیں مرنا رہو گا۔ کیونکہ تم آخری انسان ہو اس لئے پوری انسانی نسل کو مرنا ہوگا۔" راہب بن مانس نے انچارج بن مانس سے جھک کر پوچھا۔

"کیسا فیصلہ ہے۔"

"سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل"

"کیا میں اس فیصلے سے تاریخ میں زندہ رہوں گا۔" راہب نے پوچھا

"صرف آپ ہی نہیں تاریخ بن مانسیہ بھی زندہ رہے گی"

انچارج بن مانس نے کہا

"تو پھر اس بدبخت انسان کو قید خانے میں ڈال دو اور کل دونوں کو پھانسی پر چڑھا دو۔"

پروفیسر سوچنے لگا کہ دوسرا قیدی کون ہے۔

انچارج نے راہب بابا کا حکم سن کر راہب بابا کو جاکر کرسی پر بیٹھا دیا اور خود پنجرے کے پاس پلٹ آیا اور پنجرے کے ساتھ دیوار پر لگے ایک ہینڈل کو گھمایا۔ پنجرے کا فرش دروازے کی طرح کھل گیا اور پروفیسر دھم سے اس کے اندر گر گیا۔

پنجرے کا فرش اچانک اس کے پیروں تلے سے کھسکا تو وہ نیچے یوں گرتا چلا گیا جیسے ڈول رسی سے ٹوٹ کر کنوئیں میں تیزی سے گرتا ہے۔ وہ جس اندھے راستے سے نیچے لڑھک رہا تھا یہ ایک بل کھاتا ہوا ڈھلوان سرنگ نما راستہ تھا جس میں گہری تاریکی تھی۔ وہ مسلسل گرتا چلا جارہا تھا۔ اس کا جسم گیند کی طرح قلا بازیاں کھا رہا تھا۔ کبھی اس کا سر دیوار سے ٹکراتا۔ کبھی اس کے پاؤں اوپر ہوتے اور وہ ہاتھوں سے کسی شے کو تھامنے کی کوشش کرتا۔ مسلسل گرنے کے اس سفر سے جسم کا کوئی حصہ نہ تھا جس پر خراشیں نہ آئی ہوں۔ اس کا پورا بدن خون میں نہا گیا تھا مگر تکلیف کے اس سفر میں بھی وہ بدحواس نہ ہوا اور نہ ہی چیخا چلایا بلکہ ذہنی طور پر اس بات پر تیار ہوگیا کہ یہ سفر کہاں ختم ہوتا ہے اور پھر یہ سفر ختم ہوگیا اور وہ ایک کمرے کے فرش پر دھڑام سے جاگرا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے چند لمحے آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں تو اسے تاریکی میں ذرا فاصلے پر روشنی کی دو مدھم سی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ ان لکیروں کی طرف رینگنا شروع کردیا۔ اگرچہ گرم پانی سے اس کے جسم پر ہلکے ہلکے چھالے پڑ گئے تھے اور مسلسل دیوار سے رگڑ کھا کھا کر وہ چھل گئے تھے اور سارا بدن درد کی شدید لہر کی گرفت میں تھا مگر اس نے اسکی پرواہ نہ کی اور مسلسل رینگتے رینگتے وہ روشنی کی لکیروں کے پاس پہنچ گیا جو دیوار پر لگے روشن دان سے اندر آرہی تھیں۔

روشن دان کافی اونچا تھا۔ اس میں لوہے کی دو سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے تھوڑا سا آسمان نظر آ رہا تھا۔ وہ بے سدھ ہو کر فرش پر لیٹ گیا اور اپنا منہ روشن دان کی طرف کر لیا۔ اس اندھیرے قید خانے میں اس کے لئے روشنی کی یہ لکیریں ہی زندگی کی علامت تھیں وہ مرنے سے پہلے اس روشنی کو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا۔

اسے زندگی کے اس آخری لمحے میں بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اپنا بچپن، اپنی ماں، بہن بھائی اور پھر اپنی بیوی پنکی۔ کہاں گئے وہ سب لوگ۔ اس کی ذہنی سکرین پر، بچپن، لڑکپن، جوانی کی ساری فلم تیزی سے چلنے لگی اور وہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ مرنے سے پہلے وہ یادوں کے اس ہجوم کا رنگین کفن اپنے بدن کے گرد اچھی طرح لپیٹنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا ابھی کل کی بات ہے وہ گلے میں بستہ ڈال کر سکول جاتا تھا۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑے ہو کر اس کا ماتھا چوم کر اسے خدا حافظ کہتی تھی۔ پھر ماں کی جگہ اس کی بیوی پنکی نے لے لی جو اسکی ٹائی کی KNOT درست کر کے اسے الوداعی بوسہ دے کر گھر سے رخصت کرتی تھی اور اب وہ حکمران باپ کے منہ سے اپنی موت کا اعلان سن کر دنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ کیا زندگی ہے یہ زندگی

"A TALE WRIT ON THE WATER"

اس دن وہ کھائی میں کود کر زندگی کی کہانی ختم کرنا چاہتا تھا تو گدھے نے ہاتھ دے کر روک لیا۔ اب کون زندگی اور موت کے درمیان دیوار بنے گا۔ اس کی آنکھیں غمناک ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگا کاش وہ ساری دنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔ اس انفرادی موت سے وہ اجتماعی موت کتنی اچھی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی بند پلکوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر پھیل گیا۔ اس نے کروٹ بدلی اور اس کا ہاتھ کسی چیز پر پڑا تو چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ کے نیچے ایک اور انسانی وجود پڑا ہوا تھا۔ اس نے وجود کو اچھی طرح ٹٹولا تو چونک کر اپنا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ مرد کا جسم نہیں ۔ یہ عورت کا بدن ہے۔" اس کے دل نے گھبراہٹ میں سرگوشی کی --- اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ پھر جسم پر پھیرا تو سینے کے ابھار پر آکر رک گیا اور ہاتھ اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ جونہی بدن کے اس حصے پر پہنچا بدن میں ہلکی سی جنبش ہوتی اور ایک نحیف سی نسوانی آواز نے سرگوشی کی۔

"کون ہو تم۔"

یہ نحیف نسوانی آواز سن کر اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں ہر طرف روشنی کے انار چھوٹ گئے ہیں ۔ سات سال بعد یہ نسوانی آواز اس کے کان پڑی تو اس کا سارا زخمی بدن پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ فرط مسرت سے کپکپانے لگا۔ وہ نسوانی آواز پھر گونجی۔

"کون ہو تم بولتے کیوں نہیں۔"

اس نے بڑی ہمت سے اپنے جسم کی ساری طاقت زبان میں منتقل کر دی اور بولا۔

"انسان ہوں۔ انسانی قبیلے کا آخری فرد"

اس نے محسوس کیا کہ اس کی بات سن کر اس کے قریب لیٹا ہوا بدن اچھلا اور پھر اس نے دو ہاتھ اپنے چہرے پر محسوس کئے اور وہی نسوانی آواز بے چینی سے کہہ رہی تھی۔

"انسان۔ مجھے یقین نہیں آرہا" اور پھر ان ہاتھوں نے پل بھر میں اس کے چہرے ،گردن ، سینے ، ہاتھ ، پاؤں اور سارے جسم کا جائزہ لے لیا۔ اور پھر وہ آواز بے تابی سے کہنے لگی۔

"مگر تمہیں ان درندوں نے زندہ چھوڑ کیسے دیا۔"

"چھوڑا نہیں۔" وہ بولا "کل رات تمہیں اور مجھے ایک ساتھ پھانسی چڑھائیں گے۔ تاکہ انسانی نسل کا مکمل طور پر خاتمہ ہوجائے۔" اس کی بات سن کر عورت نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولا۔

"تم ان کی قید میں کب سے ہو۔"

"مجھے انہوں نے کل گرفتار کیا ہے۔" عورت نے کہا۔

"کہاں سے" اس نے پوچھا۔

"میں دو سال سے ایک خواب کی گرفت میں تھی۔"

عورت نے آہ بھر کر کہا۔

"کیسا خواب"

"میں سات سال سے اکیلی اس اجڑے جہان میں گھوم رہی ہوں۔ پتہ نہیں کن کن علاقوں کی خاک چھان چکی ہوں۔ مگر وہ خواب میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"کون سا خواب"

"میں جب سوتی ہوں ایک آدمی خواب میں آکر میرے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ اور کہتا ہے چل میرے ساتھ میں پوچھتی ہوں کہاں۔ وہ کہتا ہے جہاں راستہ لے جائے۔"

وہ خاموشی سے اس کا خواب سنتا رہا۔

"میں چلتی رہی آخر اس قلعے کے سامنے آگئی۔ قلعے کے دروازے پر کھڑے محافظوں کو میں نے بت سمجھا۔ قریب گئی تو اس نے مجھے لٹھ دے ماری۔ میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں حکمران باپ کے سامنے تھی۔ اس نے مجھے جیل میں پھینک دیا اور کہاں ابھی ایک فرد باقی ہے وہ آجائے تو دونوں کو پھانسی دی جائے گی۔ وہ شاید تمہارے بارے میں بات کر رہا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے پھانسی کا حکم سناتے ہوئے اس نے یہی کہا تھا کہ کل رات دونوں کو پھانسی لگا دو تاکہ انسانی نسل کا کا خاتمہ ہوجائے۔"

پروفیسر نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

اور پھر کچھ دیر کے بعد اس نے عورت سے کہا۔

"کیا تم اس خواب والے آدمی کو پہچان سکتی ہو۔"

"سات سال سے میں نے کسی عورت مرد کا چہرہ نہیں دیکھا۔ بس لگاتار اسے ہی خواب میں دیکھ رہی ہوں وہ سامنے آجائے تو میں فوراً" پہچان لوں گی۔" عورت نے ایک سانس میں کہا۔

عورت کی بات سن کر وہ خاموش رہا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے وہ داستان آگئی جس کے سارے کردار ایک ان دیکھی طاقت کی راہنمائی میں ایک ہی مقام پر آجاتے ہیں۔ اور یہی مقام ان کی منزل ہوتی ہے۔ ہم دونوں کا ملاپ قدرت کو منظور تھا۔ اس عورت کو خواب کھینچ کر یہاں لے آیا۔ اور مجھے گدھا مگر اس ملاپ کا کیا فائدہ۔ کیا ملاپ اس لئے ہوا ہے کہ دونوں اکٹھے مرسکیں ۔ پھر اسے گدھے کا وہ جملہ یاد آگیا۔

"میں گدھا ہو کر ہمت نہیں ہار رہا۔ تم انسان ہو کر دل چھوٹا کر رہے ہو۔"

عورت نے خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"بن مانسوں کی حکومت صرف دریا کے اس کنارے تک ہے۔ دریا پار ان کی نظر کام نہیں کرتی۔ یہ اندھے ہوجاتے ہیں۔"

"مگر دریا تک پہنچا کیسے جائے" پروفیسر نے کہا۔ پروفیسر نے یہ بات کہی تو روشن دان سے اندر آتی روشن کی دونوں لکیریں غائب ہوگئیں۔ اس نے روشن دان کی طرف دیکھا تو باہر اندھیرا ہوگیا تھا۔ اسے روشن دان سے بجلی چمکتی محسوس ہوئی۔ پھر اچانک بادل گرجنے لگے اور یہ گرج چمک لحہ بہ لحہ بڑھتی گئی۔ اس گرج میں کبھی کبھی

اسے ہیں۔"

"میں نے تمہاری آواز سن لی ہے" گدھے نے جواب دیا۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ کل رات تمہیں پھانسی چڑھا دیں گے"

"صرف مجھے ہی ہیں ۔ اسے بھی۔"

"اسے بھی کون" گدھا حیران ہو کر بولا۔

"جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے پیر چھل گئے ہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

گدھا خوشی سے چلایا

"تمہارا مطلب ۔ عورت ۔"

"ہاں" پروفیسر بولا۔ "تم ہمیں یہاں سے نکالنے کی کوئی ترکیب سوچو۔ یہی رات ہے جس میں کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

"روشن دان کی یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔ میں توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اپنے پیروں کی ضرب سے انہیں توڑنے کی کوشش کروں گا۔ تم دعا کرو۔ بادل گرجتے رہیں تاکہ سلاخ توڑنے کی آواز محافظوں تک نہ پہنچے۔" گدھے نے کہا۔

"تم جہاں کھڑے ہو یہ جگہ کونسی ہے۔" پروفسر نے پوچھا۔

"روشن دان شہر پناہ سے باہر کھلتا ہے۔ میں شہر کی چار دیواری سے باہر کھڑا ہوں۔ تم یہ اندازہ لگاؤ کہ روشن دان تمہارے قد سے کتنی بلندی پر ہے۔"

پروفیسر اچھل کر کھڑ ہوگیا اور رینگتا ہوا اس دیوار کے پاس چلاگیا جس میں روشن دان تھا۔ دیوار کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ اوپر جھانک کر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ روشن اتنا ہی بلند ہے جتنا اس کا قد۔ تقریباً چھ فٹ۔

گدھے نے پوچھا۔

"کیوں ۔ کتنی بلندی پر ہے روشن دان۔"

"تقریباً" ۶ فٹ ۔" پروفیسر بولا۔

"اس کا مطلب ہے تقریباً" ۹۸ فٹ کا مضبوط رسہ درکار ہوگا" گدھے نے کہا۔

"مگر یہ رسہ کہاں سے آئے گا۔" اس کا جواب پروفیسر کے پاس نہ تھا۔

"رسہ تو نہیں مگر میں نے یہاں ایک لوہے کی مضبوط زنجیر دیکھی ہے۔" عورت نے گدھے کی بات سن کر پروفیسر سے کہا۔

"زنجیر" پروفیسر نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ کل اندھیرے میں میرے پیر سے ٹکرائی تھی۔" عورت نے کہا۔

"چلو تلاش کرتے ہیں"

اور پھر دونوں اندھوں کی طرح زمین پر ہاتھ مارنے لگے وہ دائیں بائیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر فرش پر زنجیر ڈھونڈ رہے تھے۔ دو ایک بار وہ ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر اپنا اپنا رخ بدل کر تلاش جاری رکھی۔ ایک آدھ گھنٹہ اندھیرے میں دھکے کھاتے گزر گیا۔ اچانک عورت کا ہاتھ زنجیر پر پڑا اور وہ چلائی۔

"مل گئی زنجیر۔"

پروفیسر رینگ کر آواز کی طرف لپکا اور کہا

"کہاں ہے۔"

"میرے پاس"

"ٹھیک ہے تم روشن دان کی طرف آؤ۔"

پروفیسر انتظار کرتا رہا آخر وہ زنجیر لے کر اس سمت آگئی جس طرف روشندان تھا۔

"یہ لو" عورت نے اندھیرے میں زنجیر والا ہاتھ زنجیر ہلا کر پروفیسر کی طرف پھیلایا۔ پروفیسر نے زنجیر پکڑی اور محسوس کیا کہ زنجیر کافی لمبی ہے اور مضبوط ہے۔ اس نے روشن دان کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ساتھی رسے کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔"

"کیسے" گدھا جو مسلسل اپنے پیر سلاخوں پر مار رہا تھا۔ رک کر بولا۔

"لوہے کی ایک مضبوط زنجیر مل گئی ہے۔ جو بہت لمبی ہے" پروفیسر نے کہا۔

"ٹھیک ہے" گدھے نے کہا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ گدھا مسلسل اپنے پیروں سے لوہے کی سلاخوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ بارش' بجلی اور بادلوں کی گرج میں سلاخوں پر پڑنے والی ضربیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ عورت اور پروفیسر تاریک کمرے میں لوہے کی زنجیر تھامے چپ چاپ روشن دان کی سلاخیں ٹوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پروفیسر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ گدھا کیسے سلاخیں توڑے گا۔ کہیں وہ اس کوشش میں ناکام نہ ہوجائے۔ اگر ہوگیا۔ رات بیت گئی۔ دن نکل آیا اور بن

مانس آگئے تو پھر--------!

"نہیں - نہیں - ایسا نہیں ہوگا" وہ بے خیالی میں بڑبڑایا۔ عورت نے اندھیرے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی نظریں بے تابی سے چہرے کے خدوخال ٹٹول رہی تھیں مگر ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ پروفیسر کو اپنی منفی سوچ اچھی نہیں لگی اور وہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔ ساتھی کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔"

اور پھر اس نے اندھیرے میں اپنی داہنی طرف بیٹھی عورت کی طرف اپنی گردن موڑی۔ اندھیرے میں صرف دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ ان آنکھوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مجھے نہیں پتہ تم کون ہو۔ تمہارا مذہب کیا ہے مگر تمہاری آنکھوں کی چمک کہتی ہے۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو۔"

"اس یقین کی روشنی میں تو میں ہی زندہ ہوں۔" عورت کی آنکھوں کی روشنی نے الفاظ کا روپ دھار کر جواب دیا۔

"تو پھر اس یقین کے دائرے میں بیٹھ کر جتنی مقدس دعائیں یاد ہیں صدق دل سے پڑھو۔"

پروفیسر نے کہا اور پھر خود بھی سہما سہما یقین کے اس دائرہ میں جا بیٹھا اور آنکھیں بند کر کے اپنے سارے جسم کو حرف دعا میں ڈھال دیا۔ روشن دان کے دوسری طرف شدید بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی قیامت خیز کڑک میں گدھا اپنے دونوں اگلے پیروں سے روشن دان کی سلاخیں توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قید خانہ جس میں دنیا کے آخری جوڑے کو قید کیا گیا تھا۔ زیر زمین ایک مستطیل کمرہ تھا۔ جس میں بنا ہوا روشن دان شہرپناہ کی بنیادوں سے دو فٹ بلندی پر کھلتا تھا۔ جہاں گدھا روشن دان کی سلاخوں کے خلاف اپنے اگلے دو پیروں سے جنگ لڑ رہا تھا۔

گدھے کو موسلا دھار بارش کا کوئی خوف نہ تھا۔ بس وہ بجلی کی چمک سے

خائف تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں شہرپناہ میں بیٹھے محافظ بن مانس بجلی کی چمک میں اسے
روشن دان توڑتے دیکھ نہ لیں مگر وہ اس خوف کو ذہن سے جھٹک کر اپنے کام میں ڈٹا
رہا۔ جب وہ اپنے اگلے پیروں سے ضربیں لگا لگا کر تھک جاتا تو پچھلی ٹانگوں سے روشن
دان پر دولیتاں مارتا۔ کافی دیر کی جدوجہد کے بعد اس نے محسوس کیا کہ سلاخوں نے
اپنی جگہ سے ہلنا شروع کردیا ہے۔ سلاخوں کا سیمنٹ ٹوٹتے دیکھ کر وہ اور تازہ دم ہوگیا
اور بڑے جوش وخروش سے روشن دان توڑنے لگا۔

قید خانے میں انسانی آبادی کا آخری جوڑا ہر چیز سے بے خبر آنکھیں بند کئے
صرف ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ (1) زندگی کا خواب ۔! (2) اندھیرے سے روشنی کی
طرف سفر کا خواب۔ (3) بن مانسہ حدود سے بہت دور اپنی دنیا بسانے کا خواب ---
اور پھر ان خوبصورت خوابوں میں اچانک ایک چھنا کا سا ہوا۔ اور دونوں آنکھیں کھول
کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

"یہ کیا ہوا" عورت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اس سے پہلے کہ پروفیسر حالات
کا جائزہ لیکر کوئی جواب دیتا۔ روشن دان سے گدھے نے چلا کر کہا۔

"مبارک ہو۔ ساتھی ۔ روشن دان ٹوٹ گیا ہے۔"

یہ چھنا کا لوہے کی سلاخوں کے اس فریم کا تھا جو دیوار سے نکل کر فرش پر آگرا
تھا۔ پروفیسر نے روشن دان کی طرف جھانک کر دیکھا تو اسے ایک بڑا سوراخ نظر آیا
جس میں اب کوئی سلاخ نہیں تھی پروفیسر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے
خوشی سے بھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"THANK YOU۔ ساتھی ۔"

گدھے نے فوراً" کہا۔

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے یہ بتلاؤ کہ کیا تم لوہے کی زنجیر کا سرا روشن
دان سے باہر پھینک سکتے ہو۔"

پروفیسر نے لوہے کی زنجیر کو فوراً" اپنے قریب اکٹھا کیا اور پھر اس کے وزن کا

اندازہ لگایا۔ اونچے روشن دان پر نظر ڈالی اور بڑی مایوسی سے گدھے کو جواب دیا۔
"نہیں ساتھی زنجیر بہت بھاری ہے۔ روشن دان کی طرف پھینکنا بہت مشکل ہے۔"

"ٹھیک ہے" گدھے نے کہا۔ "اب میری بات تم دونوں غور سے سنو۔ تم روشن دان کے بالکل نیچے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا جاؤ اور اس عورت سے کہو کہ تمہارے کاندھوں پر دونوں پاؤں رکھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے اور زنجیر کا سار اپنی گردن میں لپیٹ لے۔ تم دیوار تھام کر آہستہ آہستہ کھڑے ہوجاؤ۔ جب تم کھڑے ہوجاؤ تو یہ عورت دیوار کا سہارا لیکر کھڑی ہوجائے اور زنجیر کا سرا روشن دان میں سے باہر پھینک دے میری بات سمجھ میں آگئی۔"
عورت اور پروفیسر دونوں بیک وقت بولے
"ہاں سمجھ میں آگئی۔"
"تو پھر جیسا میں نے کہا ہے۔ کرنا شروع کرو"۔ گدھے نے کہا۔
پروفیسر گدھے کی بات سن کر روشن دان کے بالکل نیچے دیوار کے پاس چلاگیا اور عورت سے کہنے لگا
"فورا" زنجیر سمیٹ کر دیاور کے پاس آجاؤ۔"
عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور زنجیر گھسیٹ کر اس کے پاس آگئی اور زنجیر کے ایک سرے کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ پروفیسر جو دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا عورت سے کہنے لگا۔
"زنجیر کا سرا گردن کے گرد لپیٹ لیا۔"
"ہاں" عورت نے جواب دیا۔
"تو پھر بہت احتیاط سے میرے کاندھوں پر دائیں بائیں پاؤں رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ میں آہستہ آہستہ کھڑا ہو جاؤں تو تم بہت احتیاط سے کھڑی ہوجانا۔" پروفیسر نے کہا۔
پروفیسر کی بات سن کر عورت اپنے دونوں پاؤں اس کے کاندھوں پر رکھ کر بیٹھ گئی۔

"میں کھڑا ہو رہا ہوں" پروفیسر نے کہا عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر نے بہت احتیاط سے کھڑا ہونا شروع کردیا۔ عورت سانس روکے اس کے کاندھوں پر بیٹھی تھی ۔ وہ جب سیدھا کھڑا ہوگیا تو اس نے کاندھوں پر بیٹھی عورت سے کہا۔

"اب احتیاط سے کھڑی ہوجاؤ۔"

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا اور آہستہ سے کھڑی ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں سے دیوار تھام لی گردن سے زنجیر کا سرا نیچے کی طرف کھسکنے لگا تو دائیں ہاتھ سے اسے پکڑلیا۔ اس کا چہرے بالکل دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ پروفیسر نے نیچے سے آواز دی۔

"روشن دان کی طرف منہ کر کے زنجیر کا سرا بائیں ہاتھ سے ساتھی کو پکڑا دو۔"

عورت نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں روشن دان کی طرف اٹھائیں تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔ روشن دان اس سے ٹھیک ایک دو انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے زنجیر روشن دان کی طرف بڑھائی تو اس کا ہاتھ روشن دان سے باہر چلاگیا۔ گدھے نے اپنے منہ میں زنجیر تھام لی اور بھاگ کر دور چلا گیا۔ اس طرح ساری زنجیر روشن دان کے باہر چلی گئی۔ وہ زنجیر چھوڑ کر دوبارہ روشن دان کے قریب آیا اور عورت سے کہنے لگا۔

"اپنے دونوں ہاتھوں سے روشن دان کی ٹوٹی دیوار پکڑلو اور کوشش کرکے اپنے آپ کو اوپر کھینچنے کی کوشش کرو۔ یہ کام اگرچہ مشکل ہے مگرذار سوچو اگر تم نہ کرپائی تو کل بن مانسیہ حکمران کے حکم کے مطابق تمہیں پھانسی چڑھا دیا جائے گا۔"

عورت نے گدھے کی بات سن کر اپنا ہاتھ اس ٹوٹی دیوار کی طرف بڑھایا جہاں سے لوہے کی سلاخیں اکھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے دوسرے ہاتھ سے دیوار پکڑ لی۔ اور پھر ساری طاقت لگار کر اپنے آپ کو اوپر کھینچا اور اپنا سر کاندھوں تک روشن دان سے باہر کھینچ لیا۔ گدھا جو اس عرصے میں زنجیر کا ایک سرا ایک درخت کے گرد لپیٹ آیا تھا۔ اس عورت کے پاس آیا اور زنجیر کا دوسرا سرا اس کے سامنے پھینک کر بولا۔

"اب اسے تھام لو۔ اور اس کے سہارے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

عورت نے اندھیرے میں گدھے کو دیکھا۔ اور اسے باتیں کرتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مگر حیرانی پر دوبارہ وہ قید خانے میں گرنے کا خوف غالب آگیا اور اس نے زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں مضبوط سہارا تھا۔ اس نے زنجیر کو اپنی طرف زور سے کھینچا اور پھر اپنے وجود کو روشن دان سے جھٹکا دے کر باہر نکالنے کی کوشش کی۔ چند لمحے کوشش کرتی رہی اور پھر پوری طاقت سے زور لگایا اور وہ مکمل طور پر روشن دان سے باہر آگئی گدھے نے روشن دان کے قریب منہ کر کے کہا۔

"ساتھی عورت روشن دان سے باہر آگئی ہے۔ اب میں زنجیر کا سرا اندر لٹکا رہا ہوں۔ تم دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لو۔ میں تمہیں باہر کی طرف کھینچوں گا۔ شاید تمہیں جسم پر خراشیں بھی آئیں۔ اس کے لئے میں تم سے پہلے ہی معافی مانگتا ہوں۔"

گدھا یہ کہہ کر درخت کی طرف دوڑ گیا۔ اور زنجیر درخت کے تنے سے نکال کر عورت کے پاس آگیا اور کہنے لگا۔

"زنجیر کا ایک سرا میری گردن میں اچھی طرح لپیٹ دو۔ اور دوسرا سرا روشن دان سے اندر لٹکا دو۔"

عورت نے تیزی کے ساتھ جس طرح گدھے نے کہا تھا کیا دوسرا سرا روشن دان سے اندر پھینک دیا۔ گدھے نے روشن دان سے آواز لگائی۔

"سرا تم تک پہنچ گیا ساتھی"

چند لمحوں بعد اندر سے آواز آئی۔

"ہاں پہنچ گیا ہے۔ تم کھینچنا شروع کرو۔"

گدھے نے پروفیسر کی بات سن کر آہستہ آہستہ چلنا شروع کردیا۔ پروفیسر نے دیوار کے ساتھ اپنے پاؤں لگا کر اوپر چڑھنا شروع کردیا۔ اور آہستہ آہستہ روشن دان کا

فاصلہ کم ہونا شروع ہوگیا۔ گدھا درخت کے پاس چلا گیا اور درخت کے تنے کے گرد زنجیر کو بل دے دیا۔ پروفیسر اب روشن دان سے ایک یا دو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ روشن دان کے پاس کھڑی عورت نے زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچا۔ تو پروفیسر کا سر روشن دان سے باہر آگیا اور پھر عورت نے پروفیسر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں سے پکڑلئے اور اسے زور لگا کر باہر کھینچ لیا۔ گدھا درخت سے بھاگ کر پروفیسر اور عورت کے پاس آگیا۔ پروفیسر جو زمین پر لیٹا تھا اسے دیکھ اٹھا اور گدھے کے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر اس کا منہ چوم لیا اور کہا۔

"ایک بار پھر تمہارا شکریہ ساتھی۔"

عورت اب تک حیرانی آنکھوں میں سجاتے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ گدھے نے جھٹکا دے کر اپنی گردن پروفیسر کی باہوں سے نکالی اور جلدی سے کہنے لگا۔

" یہ باتیں چھوڑو ۔ اور یہاں سے جلد از جلد نکلو۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے دریا عبور کرنا ہے۔ جتنا تیز بھاگ سکتے ہو میرے پیچھے پیچھے بھاگو۔ کہیں ایسا نہ ہو محافظوں کو روشن دان سے تمہارے فرار کا علم ہوجائے اور ہمارے پیچھے آجائیں۔"

یہ کہہ کر گدھے نے ایک طرف بھاگنا شروع کردیا اور اس کے پیچھے عورت اور پروفیسر نے عورت اور پروفیسر دونوں میں بھاگنے کی سکت نہیں تھی لیکن محافظ دستوں کا خوف ان کے لئے مہمیز ثابت ہوا اور ان کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی۔ یہ رات کا آخری حصہ تھا ۔تینوں رات کی تاریکی میں چھوٹے چھوٹے پتھروں' درختوں اور جھاڑیوں سے ٹکراتے رہے الجھتے رہے' گرتے رہے لیکن اٹھ کر پھر دوڑتے رہے وہ جلد از جلد دریا کنارے پہنچنا چاہتے تھے عورت اور پروفیسر دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ پروفیسر دو دن کا بھوکا تھا پانی کی ایک بوند تک اس کے پیٹ میں نہیں گئی تھی۔ عورت نے گزشتہ تین دن سے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے ایک بار دونوں ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئے۔ ان میں اب مزید چلنے کی سکت نہ تھی ۔ صبح کاذب کے آثار آسمان پر نظر آرہے تھے۔ بارش رک گئی تھی آسمان اب بالکل صاف تھا۔

تھوڑی تھوڑی روشنی سے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اب صبح زیادہ دور نہیں۔

گدھے نے ایک رک کر دیکھا تو دونوں کو اپنے پیچھے نہ پاکر رک گیا۔ نظر دوڑائی تو دیکھا دونوں ایک درخت کے سہارے بیٹھے ہیں۔۔ وہ ان کے پاس واپس آگیا اور کہنے لگا۔

"رک کیوں گئے"

"اب مزید چلنے کی ہمت نہیں" پروفیسر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "نہ اس میں ایک قدم چلنے کی طاقت ہے"

"ٹھیک ہے مگر دونوں اٹھ کر مجھ پر بیٹھ تو سکتے ہونا" گدھے نے کہا۔

پروفیسر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"نہیں یہ تم سے زیادتی ہوگی۔"

"مگر تمہیں یہ زیادتی کرنا ہوگی۔ کیونکہ مجھ میں یہ حوصلہ نہیں کہ تمہیں پھانسی کے تختے پر جھولتے دیکھوں۔ جلدی کرو دن نکلنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔"

پروفیسر نے گدھے سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ اس کی بات درست تھی۔ پروفیسر نے نڈھال عورت کو پکڑ کر گدھے پر بٹھایا اور پھر خود بھی بیٹھ گیا اور گدھے نے دوڑنا شروع کردیا۔

جب گدھا دوڑتے دوڑتے دریا کے کنارے پہنچا اور دریا میں دونوں کو لیکر اترا تو سورج بادلوں سے ان کی طرف جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ گدھے نے آہستہ آہستہ دریا میں چلنا شروع کیا اور چلتے چلتے وہ دوسرے کنارے کے قریب آگیا۔ کنارے سے گز دو گز کے فاصلے پر اس نے دونوں کو دریا میں پھینک دیا۔ خود اچھل کر کنارے پر آگیا اور ان سے کہنے لگا۔

"نہا دھوکر جلدی سے باہر آجاؤ۔ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔"

اب دونوں بہت کم تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پہلے تو دونوں نے سیر ہوکر پانی پیا پھر دونوں نے اپنے بدن پانی کے بستر پر ڈال دیئے خوب جی

کھول کر نہائے ۔ گدھا انہیں دیکھتا رہا جب دونوں نہا کر دریا سے نکل کر کنارے پر آئے تو سورج چمک رہا تھا۔

پہلی بار عورت نے پروفیسر اور پروفیسر نے عورت کو دیکھا۔ پروفیسر کو اپنے ساتھ کھڑی عورت دنیا کی حسین ترین عورت نظر آئی۔ عورت کے جسم پر کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے پانی اس کے بالوں سے ٹپک ٹپک کر اس کے جسم پر شبنم کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ وہ پروفیسر کو بڑی اپنائیت سے دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر نے اس سے پوچھا۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو۔"

"اس چہرے کو دیکھ رہی ہوں۔ جو مسلسل خواب میں میرا پیچھا کرتا رہا ہے۔"

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔

۲

تینوں سورج کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اب وہ بن مانسوں کے خطرے سے بہت دور نکل آئے تھے۔ شام نے اپنے بال بکھیرے تو وہ تینوں اس چشمے پر آگئے تھے جہاں گدھے نے پانی میں لیٹ کر فکر انگیز گفتگو کی تھی اور جہاں کے خوبصورت ماحول نے پروفیسر کو وہاں قیام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ تینوں خاموشی سے چشمے کے قریب بیٹھ گئے۔ تینوں تھکن سے نڈھال ہوچکے تھے۔ عورت تمام راستہ خاموش رہی۔ بس سر جھکا کر ان دونوں کے پیچھے پیچھے یوں چلتی رہی جیسے عورت نہ ہو کوئی گائے بھینس ہو جسے میلہ مویشیاں سے خرید کر گاؤں لے جایا جارہا ہے۔ اس کے لئے سب سے بڑی حیرانی گدھے کا باتیں کرنا تھا۔ گدھا جب بھی پروفیسر سے کوئی بات کرتا تو وہ چونک کر اسکی طرف دیکھتی۔ پروفیسر اس کی اس حیرانی سے واقف تھا۔ وہ اس کی حیرانی دور کرنا چاہتا تھا لیکن کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

گدھا اس پورے سفر میں لنگڑا کر چلتا رہا۔ پروفیسر نے کئی بار پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں مگر وہ باتوں میں ٹال گیا اور اپنی تکلیف نہیں بتلائی مگر چشمے پر آکر وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اس کی یہ تکلیف اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ پروفیسر نے اس سے ذرا تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ آخر بتلاتے کیوں نہیں کیا تکلیف ہے تمہیں۔"

"تمہیں وہم ہورہا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں مجھے۔" گدھے نے اپنی تکلیف

چھپاتے ہوئے کہا مگر وہ اپنے دونوں اگلے پیروں کو نہ چھپا سکا جو مسلسل سفر اور پہاڑی راستے کے سخت پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر بری طرح زخمی ہوگئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے" پروفیسر بے چین ہو کر بولا۔

"لوہے کا روشن دان یوں ہی تو نہیں ٹوٹا۔ ان دونوں پیروں کا خون پی کر ٹوٹا ہے۔" گدھے نے کہا۔

پروفیسر ساری کہانی سمجھ گیا اور اس کے دونوں پیروں کو قریب سے دیکھنے لگا۔ دونوں پیروں پر گہرے زخم بن گئے تھے۔ اور ان سے خون رس رہا تھا۔

گدھا آہستہ سے اٹھا اور اپنے دونوں پاؤں چشمے کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو دئے۔ اس کے قریب جا کر کہا۔

"تمہارے پیر زخمی تھے تم پھر بھی ہمیں اپنے اوپر بٹھا کر بھاگتے رہے۔"

"اگر میں ایسا نہ کرتا تو بن مانس تم دونوں کو پھانسی پر لٹکا دیتے۔" گدھے نے کہا۔

پروفیسر گدھے کی محبت اور ہمدردی سے لاجواب ہوگیا اور نہایت بے وقوفی میں بولا۔

"یار ساتھی تم کیا ہو۔"

"میں گدھا ہوں یار۔" گدھے نے مسکرا کر کہا۔

پروفیسر کو گدھے کی بات کا تو کوئی جواب نہیں سوجھا عورت سے کہنے لگا۔

"تمہیں میرے اس ساتھی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر یہ مجھے خودکشی سے روک کر تمہیں تلاش کرنے کا مشورہ نہ دیتا تو تم بن مانسوں کی قید میں پڑے پڑے سڑ جاتیں۔"

"میرے خواب میں تمہارے ساتھ یہ بھی آتا تھا۔" عورت نے پہلی بار گدھے کی طرف اشارہ کر کے بات کی اور پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر خواب میں یہ بات نہیں کرتا تھا۔"

"میں بات چیت کہاں کر سکتا تھا۔" گدھے نے پانی سے پاؤں باہر نکال کر کہا۔" "یہ معجزہ پروفیسر کی دعا نے دکھایا ہے عبادت خانے میں پتہ نہیں اوپر والے سے کیا کہا۔ مجھے بولنا سکھا دیا۔"

گدھے کی بات سن کر پروفیسر اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ گدھے نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر عورت سے کہنے لگا۔

"تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں بچا تمہارے گھر کا۔"

"نہیں" عورت نے جواب دیا۔ "پورے شہر کے ملبے سے بس میں زندہ بچی ہوں۔"

اس نے گدھے کو اپنی کہانی سنائی کہ کیسے 6 سال اجڑے شہروں میں کاٹے اور پھر کیسے خواب اس کا ہاتھ پکڑ کر بن مانسیہ سلطنت کی حدود میں لے گیا۔ گدھے نے ساری کہانی سن کر کہا۔

" جب اور جہاں کچھ ہونا ہوتا ہے انسان وہاں پہنچ جاتا ہے تقدیر میں لکھے واقعات ہو کر رہتے ہیں۔"

اسی دوران پروفیسر دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے کاندھے پر گھاس کا ایک گٹھا تھا اور جھولی میں کچھ باندھا ہوا تھا۔ قریب آکر اس نے گھاس گدھے کے سامنے رکھ دی اور عورت کے سامنے جھولی کے سارے پھل ڈھیر کر دیئے اور قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔

"قریب ہی پھلوں کا باغ ہے۔ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ اور آجائیں گے۔"

تینوں بھوکے تھے۔ پروفیسر اور عورت نے خوب سیر ہو کر پھل کھائے اور گدھے نے گھاس سے پیٹ بھر لیا۔ چشمے سے پانی پیا اور پھر تکون کے تین کونوں کی طرح ایک دوسرے کے درمیان فاصلے کی لکیر کھینچ کر سو گئے

"سلطنت بن مانیہ" سے ماڈل فارم تک کا سفر تینوں نے تیس دن اور تیس راتوں میں طے کیا۔ راستے کے تمام نشیب فراز سے گدھا اور پروفیسر دونوں اچھی طرح واقف تھے۔ عورت کو پا کر گدھا بے حد خوش تھا مگر پروفیسر اپنے دل کو عورت کی طرف مائل نہ کر سکا۔ وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتا چنگی درمیان میں آکھڑی ہوتی تھی اور وہ چنگی کے دوسری طرف کھڑی عورت کو دیکھ نہ سکتا۔ اس نہر کے پل پر جہاں جاتے ہوئے پروفیسر نے مچھلیاں بھون کر کھائی تھیں۔ تینوں وہاں پہنچے تو گدھے نے عورت کو کہا۔

"ہم ذرا اس باغ سے ہو کر آتے ہیں۔ تم نہر میں نہا لو۔ سارا سفر تم نے ایک بوند پانی جسم پر نہیں پڑنے دیا۔ میل کی تہہ جم گئی ہو گی۔"

یہ کہہ کر گدھا اور پروفیسر دونوں پیٹھ موڑ کر ایک طرف چل دئے۔ عورت انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب وہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گئے تو وہ اپنے جسم سے برائے نام پھٹے پرانے کپڑے اتار کر نہر میں اتر گئی اور تیرتی ہوئی پل کی طرف چلی گئی جہاں سنہری مچھلیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ عورت کو شفاف پانی میں اپنا جسم بھی بالکل مچھلیوں کی طرح دکھائی دیا۔ وہ بڑی دیر پانی میں مچھلیوں سے کھیلتی رہی۔ جب لہروں کے تیز طمانچے کھا کھا کر اس کا بدن لال ہو گیا تو وہ پانی سے نکل کر کنارے پر آ گئی۔

وہ حسین ترین عورت نہیں تھی۔ خوبصورت عورت تھی۔ اسے دنیا کی واحد

عورت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ لمبے بال' دراز قد' موٹی آنکھیں 'گوری رنگت' بڑی بڑی آنکھیں پتلے ہونٹ' جب وہ بن مانسیہ سلطنت کی قید سے بھاگی تھی تو یہ سب چیزیں اداسی کے میل سے اٹی ہوئی تھیں اور اس کا دل سانپ کی طرح اداسی کی پٹاری میں کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ پروفیسر اور گدھے کی صحبت میں آہستہ آہستہ دل پٹاری سے نکل کر کھلی ہوا میں لہرانے لگا تو اداسی کی گرد اس کے خدوخال سے چھٹنے لگی۔ دنیا کی بربادی سے پہلے وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ اس کا خاوند ریلوے میں انجن ڈرائیور تھا۔ انجن کے لوہے کی طرح سخت اور سیاہ فام۔ اس کی سہیلیاں جب دونوں کو ایک ساتھ بیٹھا دیکھتیں تو ہنس کر کہتیں۔

"لو آگئے دن اور رات۔" اسے اپنے خاوند کی سیاہ رنگت سے نفرت نہیں تھی۔ نفرت تھی تو اس کے وحشی پن سے۔ وہ بیوی کو بھی انجن کا کوئی کل پرزہ سمجھتا تھا جسے مروڑ کر انجن کو روکا اور چلایا جاسکتا ہے۔ وہ ریلوے ورکشاپ میں انجن بند کر کے آتا تو اپنا تھیلا چارپائی پر پھینک کر بنی سنوری خوبصورت بیوی کو پل بھر میں اجاڑ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو بچے پیدا کرنے کی مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ابھی شادی کو تین ماہ کا عرصہ ہوا تھا اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ تمہارے بچہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کم از کم ایک سال کی مہلت تو دو۔ ہوجائے گا بچہ"

مگر قدرت نے یہ مہلت نہ دی اور شادی کے ٹھیک ۶ ماہ بعد دنیا اپنے انجام تک پہنچ گئی۔

اس نے نہر سے باہر آکر پھٹے پرانے کپڑے جسم کی دیوار پر لٹکا لئے اور اس طرف دیکھنے لگی جس طرف پروفیسر اور گدھا گئے تھے۔ پروفیسر اسے اسی دن سے اچھا لگنے لگا تھا جس دن اندھیرے میں اس نے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرا تھا اور چونک گیا تھا۔ خواب میں بار بار آکر پروفیسر نے اپنے نقش اس کی یاداشت میں ثبت کردیئے تھے۔ پروفیسر کی آنکھ میں کوئی وحشی پن 'کوئی ہوس' کوئی ندیدہ پن نہ تھا مگر اپنائیت'

اور شناسائی بھی نہ تھی ۔ وہ سارے سفر کے دوران اس سے دور دور رہا۔ رات آتی تو اپنا تھیلا اٹھا کر دور جا کر لیٹ جاتا۔ کبھی تنہا اس کے پاس نہ بیٹھا۔ جب کوئی موقعہ آتا تو گدھے کو آواز دے کر بلا لیتا۔ ایک بار گدھے نے اسے جھنجلا کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مجھے بلا کر کیوں کباب میں ہڈی بنا لیتے ہو۔"

پروفیسر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم گوشت خور نہیں ہو۔ اس لئے نہیں جانتے کہ ہڈی والا گوشت کتنا مزیدار ہوتا ہے۔"

"دیکھو پروفیسر" گدھے نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے عورت کی تلاش میں یہ کٹھن سفر ہڈی والے گوشت کا مزہ دریافت کرنے کے لئے نہیں کیا۔ اس بنجر زمین میں کوئی کونپل کھلاؤ۔ اس مٹی میں میں کئی بیج چٹکنے کے لئے بے تاب ہیں ۔ اور تم ہو کہ تھیلے پر سر رکھ کر سو جاتے ہو۔"

پروفیسر نے اداس ہو کر دور خلاؤں میں جھانکتے ہوئے کہا

" تم ٹھیک کہتے ہو ساتھی۔ جب میں تمہاری محبت اور احسانات کے بارے میں سوچتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اپنے خون سے باقی زندگی تمہارے نام لکھ دوں۔ مگر میں کیا کروں جب میں اس عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو میری بیوی پنکی پتہ نہیں کہاں سے آ کر میری آنکھوں کی بصارت چھین لیتی ہے۔" گدھے نے کہا۔

"ماضی کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑاؤ۔ رومانویت کے اس دائرے کو پھلانگ کر باہر آؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ تم ہو اور یہ عورت ہے۔ اس عورت میں کہیں نہ کہیں پنکی موجود ہے تم نے کبھی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جس طرح ایک شہر میں کئی شہر ہوتے ہیں اسی طرح ایک عورت میں بھی کئی عورتیں ہوتی ہیں ان کئی عورتوں میں تمہاری پنکی ضرور موجود ہوگی۔"

گدھے کی لمبی چوڑی تقریر سن کر اس نے ہمت کر کے اس عورت کو کن انکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ دیکھا بھی مگر اس میں اسے پنکی نظر نہ آئی اور وہ

حسب معمول تھیلا سرہانے رکھ کر سوتا رہا۔

عورت نے نہر سے نکل کر اپنے بالوں کو سکھانا شروع کردیا۔ ایک عرصے کے بعد اس نے بالوں کو پانی سے دھویا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر بکھرے تو بالوں نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ تیز ہوا میں اسے اپنے اڑتے ہوئے بال بہت اچھے لگے۔ وہ کافی دیر بالوں سے لڑتی جھگڑتی رہی مگر وہ اس کے قابو نہ آئے۔ اس لڑائی میں تیز ہوا بالوں کے ساتھ تھی ۔ ایک بار ہوا نے اتنی زور کا حملہ کیا کہ سارے بال اس کے چہرے پر آگئے۔ اور اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ بالوں کی گہری تاریکی میں اس کی آنکھوں کا دم گھٹنے لگا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے گھنے بال چہرے اور آنکھوں سے ہٹائے تو سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔

پروفیسر سیاہ لمبے بالوں میں اس کا گورا چٹا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے سیاہ تاریک غار کے گول دہانے میں سے سورج اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ سورج کے اس اچانک حملے سے اسقدر گھبرایا کہ کاندھے پر لٹکا ہوا تھیلا کھسک کر زمین پر گرگیا۔ اس نے چونک کر تھیلا اٹھایا۔ کاندھے پر لٹکا کر عورت کو پہلی بار غور سے دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ پنکی اس کے سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے۔

وہ پنکی کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر خود بھی زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔" پنکی نے کہا۔

تمہیں دیکھ رہا ہوں" پروفیسر نے کہا

"اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ ہوں۔ دیکھ کر دل نہیں بھرا۔ پنکی نے مسکرا کر کہا۔

"دل اتنا چھوٹا نہیں کہ دنوں میں بھر جائے۔ اسے بھرتے بھرتے صدیاں لگیں گی۔" پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

پنکی اسکی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسی تو اس کے بالوں کی لٹ چہرے پر لہرا گئی۔ پنکی نے اسے ہاتھ سے پیچھے ہٹانا چاہا تو پروفیسر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"نہیں اسے چہرے پر ہی لہرانے دو۔ مجھے اچھی لگ رہی ہے۔"

"پروفیسر نے بے خیالی میں عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ شرما گئی اور پروفیسر گھبرا گیا۔ اس کے سامنے اس کی بیوی پنکی نہ تھی وہ عورت کو پنکی سمجھ کر باتیں کر رہا تھا۔ عورت نے اسے گھبرایا ہوا پایا تو ذرا بے تکلف ہو کر بولی۔

"کسی اور کے شک میں مجھ سے مخاطب تھے۔"

پروفیسر نے اسکی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور کہا۔

"ہاں"

عورت نے اپنے بالوں کو اکٹھا کیا اور باندھ کر ذرا سا مسکرائی اور کہا۔

"شکر ہے تمہیں مجھ پر کسی کا شک تو ہوا۔"

"شک تو پہلے بھی کبھی کبھی ہوتا تھا مگر آج یقین سا ہوگیا ہے۔" پروفیسر نے عورت سے آنکھیں چرا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یقین سے دور کیوں بھاگتے ہیں" عورت بولی۔

"بھاگا ضرور تھا مگر آج پہلی بار قریب آنے کی کوشش کی ہے۔" پروفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا اور دور کھڑے گدھے کی طرف دیکھا جو ایک درخت کے پاس کھڑا پہلی بار پروفیسر اور عورت کو اکٹھے بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گدھے کے پاس پہنچا تو گدھے نے پروفیسر کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"کیوں پنکی تم دونوں کے درمیان سے ہٹی یا نہیں"

پروفیسر نے ساتھی کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہٹی تو نہیں البتہ اس کے اندر کہیں چھپ گئی ہے۔"

عورت پروفیسر کے جانے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھی تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے کوئی نشہ آور چیز پلادی ہے شاید یہ پروفیسر کے ہاتھ کا اثر تھا۔ اس کے انجن ڈرائیور خاوند نے کئی بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا مگر وہ کبھی اس کیفیت سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔

''وہ چلتے چلتے سارے رستے قدم قدم لڑکھڑاتی رہی۔ کئی بار بے خیالی میں لڑکھڑائی تو پروفیسر نے اسے سہارا دیا۔ نہر سے ماڈل فارم تک کا فاصلہ اچھا خاصہ تھا مگر اسے ایسے لگا جیسے وہ وہاں تک اڑ کر پہنچ گئی ہے۔

ماڈل فارم سے جانے کے لئے گدھے اور پروفیسر نے دائیں طرف کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن جب وہ سفر سے واپس آئے تو ماڈل فارم میں داخل ہونے کے لئے بائیں طرف کا راستہ چنا۔ جب وہ اس گاؤں میں داخل ہوئے تو شام ہونے والی تھی۔ تینوں اجڑے گھروں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ پروفیسر اور گدھا آگے آگے اور عورت ان کے پیچھے مگر اب اس کی چال میں خریدے ہوئے مویشیوں کی مجبوری اور بے بسی نہیں تھی۔ جب سے پروفیسر کے کاندھے سے تھیلا کھسک کر زمین پر گرا تھا۔ اس کا عورت پن پلٹ آیا تھا۔ اب اس کی چال میں وہ سب کچھ تھا جسے دیکھ کر موج سے جام میں لرز جاتی ہے۔ اب چلتے ہوئے اس کے جسم پر ریشم کی سلوٹیں پڑتی تھیں اس نے سانپ کی طرح پرانا چولا اتار کر نہر کے کنارے پھینک دیا تھا۔

پروفیسر اور گدھا آہستہ آہستہ چلتے رہے اور پھر اس عبادت خانے کے سامنے آکر رک گئے۔ جس میں پروفیسر نے آغاز سفر سے پہلے محراب کے سامنے بیٹھ کر دعا مانگی تھی۔ وہ دونوں رکے تو عورت بھی رک گئی۔ پروفیسر نے گدھے کی طرف دیکھا۔

گدھے نے پروفیسر کی طرف۔

پروفیسر نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

گدھے نے اسے دیکھ کر کہا۔

"یہ آنکھیں بند کرنے کا نہیں۔ آنکھیں کھولنے کا وقت ہے" پروفیسر نے گدھے کا یہ فقرہ سن کر آنکھیں کھولیں۔ گدھے کی طرف دیکھا اور پھر پیچھے کھڑی عورت کی طرف۔ عورت اس کی تیز نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے پہلی بار

محسوس کیا کہ پروفیسر کی آنکھوں میں اتنی تیز آگ جل رہی ہے۔ عورت نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا اور اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے کھلے بال دونوں کاندھوں پر پھیل گئے۔ عورت اپنے پیر کا انگوٹھا سخت فرش پر پھیرتی رہی اور پھر اس کے سارے بدن میں ایک آتشی مادہ سا پگھل گیا۔ اس نے دیکھا پروفیسر اس کے ساتھ کھڑا تھا اور پروفیسر کا ہاتھ اس کے کاندھے پر تھا۔ پروفیسر نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

"چلو"

عورت کے قدم اٹھنے لگے۔ پروفیسر اسے لیکر عبادت گاہ میں داخل ہوگیا۔ ان دونوں کو عبادت گاہ کے اندر جاتے ہوئے دیکھ کر گدھے کی آنکھوں میں روشنی سی چمکنے لگی۔

پروفیسر عورت کو لیکر محراب کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھے اور کہنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔"

عورت نے شرما کر کہا۔

"پنکی"

پروفیسر کو محسوس ہوا جیسے دنیا ایک بار پھر برباد ہونے لگی ہے۔ اس نے عورت کا چہرہ اپنی طرف کیا اور پوچھا۔

"کیا کہا تم نے۔"

عورت نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"پنکی۔ کیوں تمہیں پسند نہیں یہ نام۔"

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے اپنے ساتھ چمٹا کر آسمان کی طرف دیکھا اور زور سے چلا کر کہا۔

"تو کل بھی عظیم طاقت تھی۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ دنیا ہزار بار فنا ہو مگر تو زندہ رہے گا۔ میں تیرے سامنے اس عورت سے جس کا نام پنکی ہے شادی

کر رہا ہوں۔"

پروفیسر نے یہ بات تین بار دھرائی اور پھر ساری محبت اپنی آواز میں سمیٹ کر پنکی پوچھا۔

"یہ شادی تمہیں بھی منظور ہے نا پنکی۔"

پنکی دور کہیں گہرے کنوئیں کی تہہ سے بولی۔

"ہاں"

اور پھر وہ پروفیسر کے وسیع و عریض سینے کے صحرا میں کھو گئی۔ عبادت گاہ سے باہر آکر پروفیسر نے گدھے کا ماتھا چوم کر کہا۔

"تمہیں مبارک ہو۔"

"ابھی نہیں" گدھے نے کہا۔ "کچھ دن بعد۔"

ساتھی کی یہ بات پروفیسر کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس نے فوراً" اپنا تھیلا کھولا۔ اور اپنی کتاب نکال کر پنکی کے ہاتھ میں دے دی۔

"میری طرف سے شادی کا تحفہ"

پنکی نے کتاب کھولی تو ماچس کی چار تیلیاں جو پروفیسر نے خاص صفحات کے درمیان نشانی کے طور پر رکھی تھیں ۔ کتاب سے نکل کر اس کے پیروں میں آگریں۔ پروفیسر ان تیلیوں پر یوں جھپٹا جس طرح بھوکا شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے ۔ تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ماچس کی خالی ڈبیہ تلاش کی اور پھر پنکی اور گدھے کو وہیں چھوڑ کر اس گھر کی طرف دوڑا جس میں اسنے صوفے کو آگ لگا کر رات بسر کی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنی قمیض اتاری۔ کپکپاتے ہاتھوں سے ماچس کی تیلی خالی ڈبیہ پر رگڑنے سے پہلے جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھیں اور پھر تیلی کو ڈبیہ پر رگڑا ایک مدھم سا شعلہ بھڑکا اور ماچس جل گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے اپنی قمیض کو آگ لگائی اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ جلتی ہوئی قمیض فرش پر رکھی اور بچے ہوئے صوفے کا کپڑا پھاڑ کر آگ میں

پھینک دیا۔ پاگلوں کی طرف دو کرسیاں اٹھائیں اور جلتی آگ پر رکھ دیں۔ گدھا اور پنکی دروازے میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد گدھا باہر چلا گیا۔ پروفیسر نے ۷ سال کے بعد پہلی بار لیٹنے سے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر پنکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کمرے میں سونے کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔

پروفیسر اور پنکی کے کمرے میں ساری رات آگ جلتی رہی اور گدھا باہر ٹیوب ویل کے چبوترے پر بیٹھا دروازے کی درزوں میں سے اس آگ کی ہلکی ہلکی روشنی کو دیکھتا رہا۔ اسے ساری رات نیند نہیں آئی۔ اسے فکر تھی کہ کمرے کی آگ پھیل کر دونوں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اس الجھن میں رات بیت گئی۔ صبح طلوع ہونے کو تھی کہ گدھے کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔

پروفیسر دیر تک سونے کا عادی تھا مگر آج اس کی آنکھ جلد کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا کمرے میں جلتی آگ بجھ گئی تھی۔ راکھ کے ڈھیر میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ پنکی اس کے پیروں سے ذرا ہٹ کر بے سدھ بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اس کے کالے لمبے سیاہ بال اس کے کاندھے پر بکھرے تھے۔ اس کے پرانے پھٹے کپڑے اس کے پورے جسم کو ڈھانپنے میں اپنی لاچاری کا اظہار کر رہے تھے۔ پروفیسر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پنکی کے پاس سے گزرا۔ ایک نظر اس پر ڈالی اور کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ باہر آکر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور گدھے کو چبوترے پر سوتا پایا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا چبوترے کے پاس آیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ گدھا اس کے آنے سے باخبر تھا۔ آنکھیں کھول کر کہنے لگا۔

"اتنی جلدی جاگ گئے تم۔"

"ہاں" پروفیسر نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں"

"شاید تم میرے قریب نہیں تھے اس لئے۔"

"مگر تمہارے ساتھ پنکی سو رہی تھی" گدھے نے کہا۔

اس کے بدن کی خوشبو کا شاید میں ابھی عادی نہیں ہوا۔" پروفیسر نے پاس پڑا ہوا ایک کنکر دور اچھال کر کہا۔

"عادی ہو جاؤ۔" گدھے نے کہا "اب میں باہر کی چیز ہوں۔"

"کمرے سے باہر تو نکل سکتے ہو" پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"دل سے کیسے نکلو گے۔"

اور پھر وہ گدھے کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولا۔

"عورت تو مل گئی۔ اب کیا کریں۔"

"کریں؟" گدھا حیرانی سے بولا۔ "کریں نہیں کرو۔"

"کیا کروں۔" پروفیسر نے بھولپن میں جواب دیا۔

"یہ بھی میں بتلاؤں کہ کیا کرو۔"

پروفیسر گدھے کے مزاح سے لطف اندوز ہو کر ہنسا اور اس کے ایک دھول جما کر بولا۔

"یار وہ بات نہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں اب ہم کیا کام کریں۔"

گدھا چبوترے سے اتر کر کھلے میدان کی طرف چلنے لگا۔ جہاں پروفیسر نے سفر پر جانے سے پہلے بیجوں کی ایک مقدار اچھال دی تھی اور اب وہاں دور تک گندم کی فصل اگی ہوئی تھی اگدھا گردن سے اشارہ کر کے بولا۔

"یہ زمین ہماری توجہ کی منتظر ہے۔ اسے آباد کریں گے۔ ہم نے اسے پیار دیا' اس کا بنجر پن دور کیا تو یہ ہمیں رزق دے گی۔ اس کے اندر بے بہا خزانہ ہے جو یہ ہماری جھولی میں ڈالنا چاہتی ہے۔ ہم یہ دفینہ زمین کھود کر باہر نکالیں گے۔"

"مگر یہاں تک پانی کیسے پہنچے گا۔ نہر یہاں سے بہت دور ہے"
"پروفیسر نے گدھے کی بات سن کر کہا۔
"تو کیا ہوا۔ ہم پانی تک پہنچ جائیں گے۔" گدھے نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس دنیا کی ساری زمین ہماری ملکیت ہے۔ ہم جہاں چاہیں ہل چلا سکتے ہیں۔"
پروفیسر نے کہا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔"
"میں نے ساری زندگی بوجھ اٹھایا ہے۔ اب بھی اٹھاؤں گا۔ تم ورکشاپ سے ہل، کدال، کسی اور دوسرا سامان مجھ پر لاد کر نہر کے کنارے لے چلو اور جلدی سے کام شروع کردو۔ تم پنکی اور میں مل کر زمین کی کایا پلٹ دیں گے۔"
پروفیسر اس سارے کام کو ناممکن سمجھتا تھا مگر واقعی چند دنوں کے بعد نہر کے پاس کی زمین کی کایا پلٹ گئی۔ ورکشاپ سے اسے ایک لمبا موٹا پائپ مل گیا۔ جس کا ایک سرا نہر میں ڈال کر اس نے پانی دینے کا مسئلہ حل کرلیا۔ پنکی اور اس نے دن رات مل کر کام کیا اور بنجر زمین کے ایک ٹکڑے کو کھیت کی شکل دے دی۔ گدھے کو ہل میں جوت کر زمین کو کاشت کے قابل بنالیا۔ ٹیوب ویل کے قریب اگی گندم کی بالیوں سے بیج نکال کر زمین میں بودئے۔ ورکشاپ کی الماریوں میں پڑے سبزیوں کے بیج زمین میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر بو دئے اور پھر پانی دے کر تینوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور دل میں ایک ہی دعا مانگی۔
"ہم سے جو ہوسکا ہم نے کردیا۔ اب تیری مرضی"
جنت سے آدم اور حوا نے نکل کر زمین پر جو جدوجہد کی تھی پروفیسر نے صرف اپنی کتاب میں لکھا تھا لیکن اب جب اسے عملی طور پر وہ سب کچھ کرنا پڑا تو اس نے آدم اور حوا کو بڑی داد دی۔ سات سال اس نے رو پیٹ کر گزار دئے تھے نہ کہیں رکا اور نہ ہی زمین نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈالی لیکن اب جب رکا تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے خون پسینہ کیسے ایک کیا جاتا ہے۔

ماڈل فارم کے سارے گھروں کی تلاشی لیکر پنکی نے اپنے اور پروفیسر کے لئے کچھ کپڑے ڈھونڈ نکالے تھے۔ ضرورت کی کچھ چیزیں جن میں برتن اور لکھنے کے لئے پنسلیں اور کاغذ تھے اکٹھے کر کے اس گھر میں رکھ لئے تھے جس میں دونوں رات کو سوتے تھے۔ آگ کا مسئلہ پروفیسر نے حل کر لیا تھا۔ ماچس کی آخری تیلی جلانے سے پہلے اس نے گھر کے ایک کونے میں چھوٹی سی بھٹی بنائی۔ بہت سی لکڑیاں رکھ کر ورکشاپ سے پٹرول نکالا۔ لکڑیوں پر چھڑکا اور پنکی سے کہا۔

" اس بھٹی میں آگ دن رات سلگتے رہنا چاہیئے۔" چنانچہ اب وہ ارد گرد سے لکڑیاں اکٹھی کرتے اور بھٹی کے سامنے ڈھیر کر دیتے جو بھی بھٹی کے قریب سے گزرتا۔ ایک لکڑی آگ میں رکھ دیتا۔

پنکی، پروفیسر اور گدھے کا سارا دن نہر کے قریب اپنے کھیت میں گزرتا۔ تینوں اٹھ کر صبح سویرے نہر پر چلے جاتے سارا دن کام کرتے شام کو فارم میں لوٹ آتے۔ جنگل کے پھلوں اور نہر کی مچھلیوں سے پیٹ بھرتے۔ چند مہینوں بعد سبزیوں نے شکل دکھائی تو تینوں خوشی سے جھوم اٹھے۔ گندم کی بالیاں ہوا میں لہرانے لگی تو خوشی سے پاگل ہوگئے۔ بالیاں اور سبزیاں زمین سے باہر نکلیں تو انہیں سلامی دینے ایک دن چانک چھوٹی چھوٹی رنگین چڑیاں کہیں سے آگئیں۔ پنکی نے پروفیسر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ادھر دیکھو ۔ کتنے خوبصورت رنگ ہیں ان کے۔"

پروفیسر نے رنگین چڑیوں کو دیکھا تو بے حد خوش ہوا ۔ اور اس کے معدے میں ہلچل سی ہونے لگی۔ اپنے قریب پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی طرف اس کا ہاتھ بڑھا ہی تھا کہ گدھے نے بڑی رعب دار آواز میں کہا۔

" نہیں ساتھی۔ ان آزاد شہریوں کا اب قتل نہیں ہوگا۔ اب تم کسی معصوم پرندے کو بھون کر نہیں کھاؤ گے۔ اس دنیا میں بڑی گھٹن ہے۔ ان کی معصوم آوازوں کے گیت فضاؤں میں گونجنے دو۔ شاید کچھ اداسی دور ہو۔"

پروفیسر کا پتھروں کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے گدھے کی طرف دیکھ کر معذرت کی اور کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ان کی آزادی میں خلل نہیں آئے گا۔"

چڑیوں کی آبادی بڑھتی رہی۔ فصل کٹی تو گندم کے دانے چگنے کے لئے چاروں طرف چڑیوں اور پرندوں کے گیت گونجنے لگے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ رت بدلی تو پھولوں کے رنگ فضاؤں میں گھلنے لگے۔

گندم کی کٹی ہوئی فصل کھیت میں بکھری ہوئی تھی گدھا اس پر دوڑ رہا تھا اور گندم کے خوشوں اور بالیوں سے دانے نکل نکل کر ہوا میں اچھل رہے تھے۔ اس نے دوڑتے ہوئے فارم سے آتے ہوئے راستے پر نظر دوڑائی۔ اسے اکیلا پروفیسر آتا ہوا نظر آیا جب وہ قریب آگیا تو گدھا رک گیا اور پوچھا۔

"پنکی کہاں ہے"

"اسکی طبعیت ٹھیک نہیں" پروفیسر نے جواب دیا۔

"اچھا کیا تم نے اسے ساتھ لیکر نہیں آئے۔ ان دنوں میں عورتوں کا کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" گدھے نے دوبارہ دوڑ شروع کرتے ہوئے کہا۔ کھیت کا چکر لگا کر دوبارہ پروفیسر کے قریب آکر رکا اور آنکھ دبا کر شرارت سے کہنے لگا۔

"میری دعا ہے لڑکی پیدا ہو۔"

"لڑکا کیوں نہیں" پروفیسر نے ایک "سہ شاخہ" لکڑی سے بھوسے کو ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی پیدا ہو تو اس کے ساتھ 70 فرشتے آتے ہیں" گدھے نے کہا۔

"اور اگر لڑکا پیدا ہو تو" پروفیسر نے پوچھا۔

"70 شیطان" گدھے نے قہقہہ لگا کر کہا اور پھر دوڑتا ہوا دور نکل گیا۔

پروفیسر نے "سہ شاخہ" لکڑی سے بھوسے کو ہوا میں اچھالنا شروع کیا تو گندم کے دانے سنہری کنکروں کی طرح اس کے اردگرد بکھر گئے۔ اس نے مسکرا کر دیکھا تو

اسے چاروں طرف دانے ہی دانے ہوا میں رقص کرتے نظر آئے اور پھر یہ گندم کے دانے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تبدیل ہو گئے جن کے بازوؤں کے ساتھ سنہری پر لگے ہوئے تھے اور وہ ہوا میں چاروں طرف اڑ رہے تھے۔

پروفیسر نے محسوس کیا جیسے وہ ایک خوبصورت سرسبز وادی میں کھڑا ہے۔ جو ایسے ہی خوبصورت بچوں سے بھری ہے۔ سارے بچے دو تین سال سے زیادہ عمر کے نہیں۔ ان کے سنہری بال ہوا میں کرنوں کی طرح لہرا رہے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں' درختوں کی شاخیں' گھاس کے میدان سب ان خوبصورت پریوں جیسے بچوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وادی کے بالکل درمیان میں ایک خوبصورت تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر ننھے منے پروں والے بچوں کا ایک ہجوم تھا۔ تخت سے ذرا ہٹ کر اونچی پہاڑی سے دو جھرنے وادی میں گر رہے تھے۔ کچھ شرارتی بچے اڑتے اڑتے جھرنوں کی طرف جاتے ایک دوسرے کی طرف پانی اچھالتے اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے واپس لوٹ آتے۔ بچوں کی یہ چھیڑ چھاڑ' ہنسی مذاق جاری تھا کہ اچانک ساری وادی ایک پروقار اور جاہ و جلال سے بھرپور آواز سے گونج اٹھی مگر اس آواز میں محبت اور پیار کی شیرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"تم سب یہاں کیا کر رہے ہو"

"کھیل رہے ہیں" ایک چھوٹی بچی نے جواب دیا

"مگر تمہیں تو نیچے جانا تھا۔" آواز نے کہا

"مجھے ڈر لگتا ہے"

"ڈر لگتا ہے؟۔ کس سے" آواز نے پوچھا۔

"انسان سے ۔ وہ جب آگ اور بارود کا کھیل کھیلتا ہے تو ہمارے کھیلنے کے سارے باغ جلا دیتا ہے۔" بچی نے کہا۔

"بلکہ ہمیں بھی جلا دیتا ہے۔" دوسری بچی نے کہا" اس نے جھرنوں اور ندی کے پانی میں زہر گھول دیا ہے۔ ہمارے چند اماموں کی شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے۔"

آواز خاموش رہی۔

پہلی بچی اڑتی ہوئے تخت پر آبیٹھی اور کہا۔

"ہمیں جنم دے کر گندی نالیوں میں پھینک دیتا ہے۔ اور پھر اخباروں میں تصویریں چھاپ کر گلی گلی اخبار بیچتا ہے۔"

سارے بچے ہوا میں ادھر ادھر اڑنے لگے اور ننھی منھی آوازوں میں چلانے لگے۔

"ہم نہیں جائیں گے اس کی دنیا میں۔ نہیں جائیں گے۔"

چند لمحے آوازیں گونجتی رہیں اور پھر وہی پروقار آواز نے اسی محبت اور پیار سے کہا

"اچھا بابا اچھا نہ جانا مگر میری بات تو سنو میں اسے بلا کر ڈانٹتا ہوں۔"

اور پھر پروفیسر نے دیکھا کہ نورانی مخلوق کے کچھ لوگ جن کے چہرے نور سے دمک رہے تھے اسے لیکر وادی میں آئے اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ وہی پروقار اور جاہ جلال والی آواز اس سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھ رہے ہو۔ ان معصوم روحوں کے چہروں پر تمہارے لئے کتنی نفرت اور بیگانگی ہے۔ یہ نفرت تم سے نہیں۔ تمہاری ان کرتوتوں سے ہے جو تم نے دنیا میں کیں۔"

پروفیسر نے سر جھکا دیا۔ آواز کی دہشت سے وہ لرزنے لگا۔

بچے پھر مچل کر بولے۔

"یہ اب معصوم بنتا ہے مگر جب یہ زمین کے سینے پر تن کر چلے گا تو ظالم اور جابر بن جائے گا۔ ہم اس کے پاس نہیں جائیں گے۔"

"اس کے ظلم اور جبر کی سزا اسے مل گئی ہے۔" آواز نے بچوں کو پیار سے سمجھایا۔

"اس کی فرعونیت، ظلم، انا اور دہشت کے سارے بت مٹی پر اوندھے منہ

پڑے ہیں - اب یہ تنہا ایک ایسی دنیا بنائے گا۔ جس میں ایسا کچھ نہیں ہو گا جس سے تم ڈرتے ہو۔"

"وعدہ" بچی نے کہا۔

"وعدہ" درخت نہیں کٹیں گے - آواز نے ہنس کر کہا۔

درخت نہیں کٹیں گے - بچی نے پوچھا

" درخت نہیں کٹیں گے۔" آواز نے کہا۔

"ہوائیں پیٹرول سے بدبو دار نہیں ہوں گیں" بچی نے کہا

"نہیں ہوں گی"

"بندوق نہیں بنائے گا یہ -" بچی نے کہا۔

"بالکل نہیں بنائے گا" آوز نے کہا۔

"اخبار تو نہیں چھپے گا نا" بچی نے کہا۔

" بالکل نہیں چھپے گا۔ " آواز نے کہا۔

" اخبار کی خبریں دیکھ کر ہمیں وحشت ہوتی ہے" بچی نے کہا۔

" نہیں ہوگی وحشت" آواز نے کہا۔

" اس کا مطلب ہے دنیا اب جنت کی طرح ہوگی" ایک بچی نے ادھر سے ادھر اڑ کر کہا۔

" ہاں مجھے امید ہے" آواز نے محبت ' وقار اور جلال سے بھرپور آواز میں کہا۔

گدھے نے زور سے آواز نکالی اور پروفیسر سے پوچھا۔

"کہاں سوچ میں گم ہو۔ میں اتنی دیر سے چلا رہا ہوں - کیا سوچ رہے ہو۔"

پروفیسر جھر جھری لیکر چونکا۔ اس کے سامنے کٹی فصل کا ڈھیر لگا تھا اور وہ پر سے اور دانوں کے درمیان کھڑا تھا نہ وہ وادی تھی۔ نہ بچے اور نہ وہ پر وقار آواز۔

دوسرے دن گدھا چبوترے سے اٹھ کر نہر پر جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ

پروفیسر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے ہاتھوں میں کچھ اٹھائے تیزی سے باہر نکل آیا اور بھاگتا ہوا گدھے کے قریب آیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

گدھے نے پوچھا۔

"خیریت ہے نا"

"ہاں خیریت ہے"۔ پروفیسر نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔" دیکھو ساتھی۔ لڑکی ہوئی ہے۔ چنکی کے۔ یہ کہہ کر پروفیسر نے ہاتھوں میں پکڑا ہوا بچہ گدھے کی طرف بڑھا دیا اور کہا

"مبارک ہو تمہیں"

گدھے نے بچے کو پیار سے دیکھا اور اپنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیئے اور کہا۔

"میں اسی مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا"

"اس کا نام کیا رکھیں ساتھی" پروفیسر نے پوچھا

"چوتھی دنیا" گدھے نے کہا۔

پروفیسر مستقل جلی بھٹی کی روشنی میں فرش پر کاغذ پھیلائے لکھ رہا تھا۔ ساتھ والے اجڑے شہر کے ایک سٹور سے اسے کافی تعداد میں پینسلیں، سیاہی کی دواتیں، کاغذ اور پن مل گئے تھے۔ پروفیسر نے چوتھی دنیا کی ذہنی اور فکری تربیت کے لئے چھوٹی چھوٹی کئی کتابیں کاغذوں پر لکھ دی تھیں اور اب وہ ایک بڑی کتاب لکھ رہا تھا۔

پنکی اس کے پاس تین لکڑی کے بڑے ڈبے رکھے کنکر ڈبوں سے نکال نکال کر گن رہی تھی۔ یہ تین ڈبے پنکی کے کلینڈر تھے جن سے وہ دنوں، مہینوں اور سالوں کا حساب رکھتی تھی۔ چوتھی دنیا کے پیدا ہوتے ہی پنکی نے یہ تین ڈبے کونے میں رکھ لئے تھے۔ پہلے ڈبے میں ہر شام ایک کنکر ڈال دیتی تھی۔ جب پہلے ڈبے میں تیس کنکر ہو جاتے تو وہ دوسرے ڈبے میں ایک کنکر ڈال دیتی اور جب دوسرے ڈبے میں ۱۲ کنکر ہو جاتے تو تیسرے ڈبے میں ایک کنکر پھینک دیتی۔ دنوں، مہینوں اور سالوں کا یہی تین ڈبے پیمانہ تھے۔

پنکی نے تیسرے ڈبے کے کنکر گنے تو وہ پانچ تھے۔ اس نے پانچوں کنکر پروفیسر کے سامنے رکھ دیئے۔

"پورے پانچ سال کی ہو گئی ہے چوتھی دنیا"

پنکی نے فخر سے کہا۔

"چوتھی دنیا کی کہانی بھی مکمل ہو گئی ہے۔"

پروفیسر نے ایک کاغذ اٹھا کر پنکی کو دکھا کر کہا۔

"یہ منشور چوتھی دنیا کی کہانی کا آخری صفحہ ہے۔ شاید آنے والے زمانے میں کوئی اس کو پڑھے۔ یہ عظیم طاقت کے سامنے کیا ہوا وعدہ ہے جو آئندہ نسل کو نبھانا ہوگا۔ ورنہ کوئی میرے اور تیرے جیسا پانچویں دنیا کی بنیاد رکھے گا۔"

"کون سا وعدہ ہے" پنکی نے پوچھا۔

"وہی وعدہ جو چوتھی دنیا نے زمین پر آنے سے پہلے عظیم طاقت سے لیا تھا۔"

پروفیسر نے کاغذ اٹھا کر آنکھوں کے قریب کیا اور پڑھنا شروع کردیا۔

"درخت نہیں کٹیں گے۔ بندوق نہیں بنے گی۔ پرندے قتل نہیں ہوں گے۔ اخبار نہیں چھپے گا۔ پانی اور ہوا میں کوئی زہر نہیں گھولے گا۔ جانور اور انسان مل جل کر رہیں گے۔"

دروازے کے پاس کھڑے گدھے نے جب یہ بات سنی تو زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"شکریہ پروفیسر شکریہ۔"

چوتھی دنیا جو کمرے کے کونے میں بچھے پلنگ پر سو رہی تھی۔ گدھے کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھ کر اپنی نیند سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اور کہنے لگی

"بابا۔ کیا صبح ہوگئی ہے۔"

پروفیسر نے کاغذ فرش پر رکھ کر کہا۔

"نہیں بیٹی ابھی تو صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔"

"تو پھر انکل کیوں بول رہے ہیں۔" چوتھی دنیا نے کہا۔

"ہم باتیں کر رہے تھے بیٹی" گدھا باہر سے زور دار آواز میں بولا۔

"اچھا اچھا اب سب باتیں بند کرو اور سو جاؤ۔ صبح سب کو بہت کام کرنا۔"

چوتھی دنیا نے کہا اور پلنگ پر لیٹ گئی ---- چوتھی دنیا کی بات سن کر پروفیسر نے کاغذ سمیٹے۔ پنکی نے کنکر ڈبوں میں ڈالے گدھے نے باہر اپنی سونے کی جگہ تلاش کی اور پھر سب گہری دنیا سو گئے ----

سورج طلوع ہوا تو چاروں نہر کے کنارے کھیت میں کام کرنے چلے گئے ------ گدھا لکڑی کے ہل میں جتا ہوا تھا۔ ہل کی ہتھی پر پروفیسر کا ہاتھ تھا اور وہ کھیت میں سیدھی گہری لکیریں بناتا جارہا تھا۔ جس میں پنکی ہاتھ سے بیج بو رہی تھی۔ تیسری دنیا کے تینوں فرد اپنے کام میں مصروف تھے۔

چوتھی دنیا کھیت کے ساتھ پھولوں کی ایک کیاری میں بڑے درخت کے نیچے خوبصورت پرندوں، چھوٹی چھوٹی رنگین چڑیوں، فاختاؤں، بلبلوں اور کبوتروں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ کچھ چڑیاں اس کے شانوں پر بیٹھی تھیں فاختائیں چوتھی دنیا کے ہاتھوں سے دانے چھین چھین کر لے جارہی تھیں اور چوتھی دنیا قہقہے لگاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ ہرے، نیلے، سرخ اور سفید پھول شاخوں اور پتوں سے سر نکال نکال کر چوتھی دنیا کو دیکھ رہے تھے۔

KAKO
LIBRARY
Near K... Market,
Nazimabad-4 Karachi-18

یہ چھوٹا سا ناول بڑی گہرائی اور بے پناہ گیرائی کا حامل ہے۔ اس میں دانش، حکمت، تفنن، طاقت اور سطوت سبھی کچھ ہے اور جیسا کہ فکشن کی بڑی کتابوں کا چلن ہوتا ہے۔ چوتھی دنیا کے اندر مشاہدات و معانی کے نا مختتم پرتوں کی ایک کائنات اُمڈی پڑتی ہے۔

اوّل اوّل اس ناول کو پڑھتے ہوئے اس آباد دنیا کا بیرونی محل وقوع ہی واضح ہوتا ہے لیکن جب کتاب ختم کر کے اس ہونی کے حوالے سے اپنے آپ کا جائزہ لیتے ہیں تو چوتھی دنیا سے پہلی مرتبہ آپ کا اصل تعارف ہوتا ہے۔

روبی کی تخلیق کردہ یہ عجیب و غریب دنیا گو دیکھنے اور سننے کے لیے آباد کی گئی ہے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس کے واقعات کی ساری جھالریں مشام سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ ان اوراق میں سے گزرتے ہوئے مجھے جنگلوں، صحراؤں، سمندروں اور کھنڈروں کی خوشبوئیں قدم قدم گلے ملتی رہیں — ان بنتی بگڑتی دنیاؤں اور ختم ہوتے معاشروں کے اندر سے کبھی مجھے جامۂ خضر کی خوشبو آتی تھی اور کبھی جبۂ الیاس کی باس! ایک عجیب ست رنگا کھیل تھا جو کتاب پڑھتے وقت بھی رچا رہا اور اب اسے ختم کر چکنے کے بعد بھی جاری ہے۔

روبی کو بات کرنے کا بہت اچھا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کی گفتگو کا وہی انگ ہے جو قدیم یونانی فیلسوفوں کے تلامذہ کا انگ تھا۔ انہوں نے فورم میں دن رات کی حاضریوں سے یہ علم حاصل کیا تھا اور روبی نے ان کی سرگزشت احوال سے یہ ہنر حاصل کیا ہے۔ دونوں نے خوب کیا اور دونوں ہی نے اپنی اپنی بساط کے مطابق علم کے میدانوں میں چاندنا کیا۔

"چوتھی دنیا" اپنے سارے دکھوں اور خونچکاں ماضی کے باوجود امید اور آس کی ایک ایسی دنیا ہے جس میں پہچان اور آشنائی کے سرے پر رجا کا ایک چراغ روشن ہے۔ اور وہ لوگ جو امید واصل کے نام سے بھی نا آشنا ہیں اس دیے کی لو میں ایک دوسرے کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

اشفاق احمد